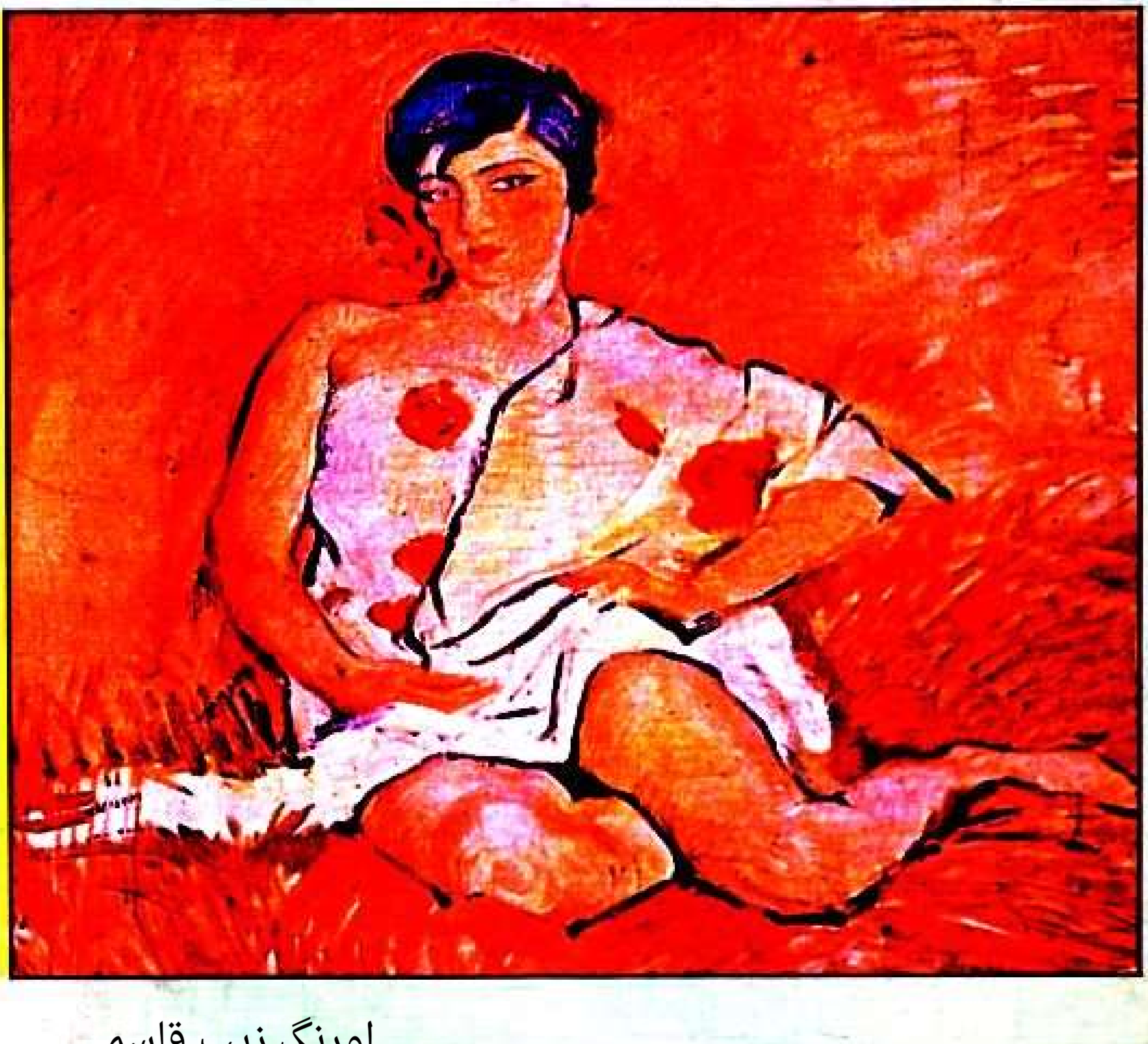
امرتا پریتم

شاعرہ سارا شگفتہ کا زندگی نامہ

ایک تھی سارا



اورنگ زیب قاسمی

نام کتاب : ایک تھی سارا
مترجم : ع صدیقی
پبلشرز : فکشن ہاؤس
18 مزنگ روڈ لاہور 7237430، 7249218
کمپوزنگ : غالب کمپوزرز لاہور فون 7572642
پرنٹرز : زاہد بشیر پرنٹرز لاہور
سرورق : ریاظ
اشاعت اول : 1994ء
قیمت : 90 روپے

ترتیب

جلتے ہوئے حروف

میں نے آسمان سے ایک تارا ٹوٹتے ہوئے دیکھا ہے۔
بہت تیزی سے آسمان کے ذہن میں ایک جلتی ہوئی لکیر کھینچتا ہوا۔۔۔۔
لوگ کہتے ہیں تو سچ ہی کہتے ہوں گے کہ انہوں نے کئی بار ٹوٹے ہوئے ستاروں کی گرم راکھ زمین پر گرتے دیکھی ہے۔۔۔۔۔
میں نے بھی اس تارے کی گرم راکھ اپنے دل کے آنگن میں برستی ہوئی دیکھی ہے۔۔۔۔

جس طرح اور تاروں کے نام ہوتے ہیں' اسی طرح' جو تارا میں نے ٹوٹتے دیکھا اس کا بھی ایک نام تھا۔۔۔۔ سارا شگفتہ۔
اس تارے کے ٹوٹتے وقت آسمان کے ذہن میں جو لمبی اور جلتی ہوئی لکیر کھینچ گئی تھی' وہ لکیر سارا شگفتہ کی نظم تھی۔۔۔۔
نظم زمین پر گری تو خدا جانے اس کے کتنے ٹکڑے ہوا میں کھوگئے۔ لیکن جو راکھ میں نے ہاتھ سے چھو کر دیکھی تھی اس میں کتنے ہی جلتے ہوئے حروف تھے جو میں نے اٹھا اٹھا کر کاغذوں پر رکھ لئے۔۔۔۔
نہیں جانتی' خدا نے ان کاغذوں کو ایسی بددعا کیوں دی ہے کہ آپ ان پر کتنے ہی جلتے ہوئے حروف رکھ دیں' وہ کاغذ نہیں جلتے۔۔۔۔
جن لوگوں کے پاس احساس ہے' جلتے ہوئے حروف پڑھتے ہوئے ان کے احساس سلگنے لگتے ہیں مگر کوئی کاغذ نہیں جلتا۔۔۔۔
شاید یہ بددعا نہیں ہے۔۔۔ ہے بھی تو اسے بددعا نہیں کہنا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو خدا جانے دنیا کی کتنی کتابیں اپنے حروف کی آگ سے جل گئی ہوتیں۔۔۔۔

مینا بازار

سارا کی نظم کے کچھ لفظ ہوا میں کھڑے تھے۔۔۔۔۔

ع ۔۔۔ ز ۔۔۔ ت کی ب ۔۔۔۔۔ ہ ۔۔ ق ۔۔ س ۔۔۔ میں ہیں ۔۔۔

اور وہ لفظ جس طرف دیکھ رہے تھے وہاں ایک بہت لمبا بازار دکھائی دے رہا تھا' صدیوں تک لمبا۔۔۔۔

وہاں طرح طرح کے لوگ نظر آ رہے تھے۔ مرد بھی' عورتیں بھی۔۔۔۔ ان کے پیرہن سے لگتا تھا کہ ہر پیرہن کی وضع قطع' کڑھائی سلائی اور رنگ الگ الگ صدیوں کے ہیں۔۔۔۔

کچھ دکانوں پر نظر گئی' میں نے دیکھا ۔۔۔۔ طرح طرح کے زیورات بھی بک رہے تھے۔ سنہرے تابوت بھی' ریشم کے کفن بھی اور وہاں ہاتھوں کی مہندی' مانگ کا سیندور اور کناری والے گھونگھٹ بھی بک رہے تھے۔۔۔۔

اور پورے بازار میں' سارا کی نظم کے ٹکڑے ہوا کی طرح لہریں لے رہے تھے۔۔۔

"عزت کی بہت سی قسمیں ہیں
گھونگھٹ' تھپڑ' گندم
عزت کا سب سے چھوٹا اور سب سے بڑا
حوالہ عورت ہے۔۔۔۔
گھر سے لے کر فٹ پاتھ تک کچھ بھی ہمارا نہیں
عزت ہمارے گذارے کی بات ہے۔۔۔۔"

بازار میں کبھی کبھی ایک چیخ ابھرتی تھی' لیکن پھر ایک ہنسی کی قبر میں اتر جاتی تھی۔۔

۔ اور کبھی کبھی ہر آواز پر ایک سناٹا طاری ہو جاتا تھا۔ ۔ ۔

یہی سناٹے کا عالم تھا کہ سارا کی نظم کے کتنے ہی ٹکڑے میرے کانوں سے ٹکرانے لگے۔

"عزت کے نیزے سے ہمیں داغا جاتا ہے
عزت کی کنی ہماری زبان سے شروع ہوتی ہے
کوئی رات ہمارا نمک چکھ لے
تو ایک زندگی ہمیں بے ذائقہ روٹی کہا جاتا ہے

- - - - -

تم ڈر میں بچے جنتی ہو اسی لئے آج تمہاری کوئی نسل نہیں
تم جسم کے ایک بند سے پکاری جاتی ہو
تمہاری حیثیت میں تو چال رکھ دی گئی ہے
ایک خوبصورت چال
جھوٹی مسکراہٹ تمہارے لبوں پر تراش دی گئی ہے
تم صدیوں سے نہیں ہنسیں
تم صدیوں سے نہیں روئیں
کیا ماں ایسی ہوتی ہے کہ مقبرے کی سجاوٹ کہلوائے
تمہارا نمک کیا ہوا!

- - - - -

عورت تو کبھی شہید نہیں ہوئی
تم کون سی نماز پڑھ رہی ہو

- - - - -

تمہارے بچے آج تم سے ضد نہیں کرتے
تم سے زنا کرتے ہیں
تم کس کنبہ کی ماں ہو؟
زنا بالجبر کی؟

Aurang Zeb Qasmi.
aurangzeb345@gmail.com

قید کی۔۔۔۔
بیٹوں کے بٹے ہوئے جسم کی؟
اور اینٹوں میں چنی ہوئی بیٹیوں کی؟

۔۔۔۔۔

بازاروں میں تمہاری بیٹیاں
اپنے لہو سے بھوک گوندھتی ہیں
اور اپنا گوشت کھاتی ہیں

--○--

اس مینا بازار سے' جس سے ایک بھولی لڑکی نے ایک دن عزت کے نام پر شادی کا جوڑا اور ایک گھونگھٹ خریدا تھا سارا نے بعد میں مجھے اس لڑکی کی داستان لکھی۔۔۔۔
داستان لکھنے تک وہ بھولی لڑکی کچھ بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ سارا کی ماں بھی۔۔۔
۔

ماں کے روٹی پکانے کی آواز سے میرے جسم میں بھوک شامل ہوتی گئی۔
میں نے دھرتی پر دانے بھوننے کی لے سے چلنا سیکھا۔۔۔
اور آگ کا رنگ میرے لباس پر رہنے لگا۔۔۔
میں زمین کچھ یوں دیکھتی کہ شاید چونی یا اکنی پاؤں تو میں املی کو چٹخارہ سکھلاؤں۔۔۔
باپ کی ترنگ ایک دوسری عورت نکلی' اور باپ کی تو بارات نکل گئی۔۔۔
حرج صرف اتنا ہوا کہ ماں کو اکثر پریشان پانے لگی۔ وہ پگلی سمجھتی تھی' پنگھٹ پر رسی جل جاتی ہے حالانکہ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ زندگی تو ایک راستہ ہے' ایسا راستہ کہ ہر مسافر کی تھکن جاتی جاتی ہے۔۔۔۔
لیکن شاید ایک بات بھول رہی ہوں کہ اسی ایک پنگھٹ پر میری ماں اور میرے باپ نے اکٹھے چلنے کا عہد کیا تھا۔ اور میری ماں گھر والوں کو بتائے بغیر چپکے سے اپنے رانجھے کے ساتھ ہو چلی تھی۔۔۔۔۔
اور اب رانجھا دوسری شادی کر چکا تھا۔۔۔۔
اسی لئے ماں کئی بار ہمیں باری باری سے دیکھتی۔۔۔۔

میں خاموشی سے کہتی۔۔۔۔ہاں' وہ تو قیدی تھا' تیرا اصلی رانجھا تو تیرے پاس ابھی آیا ہی نہیں۔۔۔۔۔

لیکن ماں کی ماں نے صرف رکنا سیکھا تھا' اس لئے بچوں کو اپنی بھوک میں شامل کرلیا تھا۔۔۔۔

اب اکثر چولہے میں آگ جلانے کے لئے کچھ نہ ملتا اور ہمارے گھر میں آگ پیاسی ہی ہوتی چلی گئی۔۔۔۔۔

آگ سے زیادہ ماں کے آنسو گنتی اور آنکھوں کو خاموش کرتی رہتی۔ سو وہ برتن بھی بکنے لگے جن پر میرے باپ کا نام کھدا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔

جو بکتا' ماں بڑے پیار سے ہمیں کھلاتی اور کبھی کبھار اس عورت کو کوستی رہتی جس کو میرے باپ نے ہمارے برتنوں پر لاگو کردیا تھا۔

بڑا بھائی' جسے پہلوٹھی کی آنکھ کہتے ہیں' نویں میں پڑھ رہا تھا۔ کبھی کبھار پوسٹ مین منی آرڈر دے جاتا اور جب انتظار تلاشی لینے لگتا' ماں سوچتی ہی رہتی۔۔۔۔

ایک دن ماں دوہرے نقاب میں چھپی گھر سے نکلی اور پھول پرونے والوں کا دکھ لے کر آگئی۔

ہم سب بہن بھائی پھول پرویا کرتے ۔ میں پھول پروتے ہوئے سوچتی۔ پھول کی تنظیم میں سوئی شامل ہوتی ہے۔۔۔۔۔

اور میں جان گئی کہ پھول کئی رنگوں میں کیوں ہوتے ہیں اور ہر جذبے ضبط کی دھجی کیوں لگتی ہے۔۔۔۔

پھول پرونے سے بھی پیٹ کی آگ ٹھنڈی نہ ہوتی۔۔۔۔

ایک روز پڑوسن نے ماں سے کہا۔ کب تک چولہا نہیں دہکے گا۔؟ میں زکوۃ کے پیسے سارے محلے سے اکٹھے کرکے لائی ہوں۔۔۔۔

ماں نے بچوں کی طرف دیکھا تو چھوٹی بہن اچانک بولی۔ امی لے لو پیسے' میرا یونیفارم بن جائے گا۔۔۔ اور پھر سارے بچوں کی فرمائشیں۔۔۔۔ میں جو چارپائی پر اوندھی لیٹی تھی دیکھا تو ماں کے ہاتھ میں نوٹ تھے اور وہ عورت جا چکی تھی۔

اب ماں روٹی پکانے لگی تو ہم سب بچے چولہے کے اردگرد بیٹھ گئے اور اپنی اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔۔۔۔۔

میں ماں سے ہمیشہ آدھی روٹی اور آخری روٹی مانگتی۔
میں آگ کو غور سے دیکھتی۔ اچھا تو یہ بھی زرد رنگ کے پھول پرو رہی ہے۔۔۔
میں اکثر منہ ہی منہ میں دعا مانگتی۔ اللہ کرے آج پھولوں والا نہ آئے۔۔۔۔ کیونکہ میری پوروں پر سوئی سے نشان پڑجاتے تھے۔۔۔۔ دعا قبول ہوئی' پھول والا نہیں آیا۔ بہن بھائیوں کے چہروں پر زرد' سرخ' سفید اور لال رنگ کی ہنسی تھی اور ماں شاید ہمیں دیکھ کر اپنی راتیں یاد کر رہی تھی۔۔۔۔
میں چوہے کی خواہش اوڑھے' چپکے چپکے چوں چوں کر رہی تھی اور بھوک کی تھوتھنی انسان سے چھپی پھر رہی تھی۔۔۔۔۔
میں نے دیوار سے اگلی الماری کے پٹ کھولے اور سوکھے ٹکڑے دونوں مٹھیوں میں بھر لئے۔ کٹر کٹر کی آواز سے لحاف میں دبکے میرے بہن بھائی اپنی خاموش آواز سے باہر نکلے اور مجھے روٹی کی طرح دیکھنے لگے۔۔۔۔
"میں سارے ٹکڑے اٹھا لائی اور انسان کے بل میں روٹی رکھ دی۔۔۔۔" مجھے لگا۔۔۔ زرد رنگ کے پھولوں کی حیرت' اس حیرت سے ملتی جلتی تھی جس کا ذکر سارا نے میرے ساتھ اپنی ملاقات میں کیا تھا۔

میں - ماں بننے کے بعد بھی کنواری ہوئی
اب میری ماں بھی کنواری ہوئی۔۔۔۔
اب تم کنواری ماں کی حیرت ہو۔۔۔

اس "تم" لفظ میں سارا جن سے مخاطب ہوئی۔۔۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے عزت کے نام پر مینا بازار سے سارا کے لئے گھونگھٹ خریدے اور سارا نے سب گھونگھٹ اتار دیئے۔
سارا نے دیکھا کہ پورا مینا بازار حیرت میں آگیا۔۔۔ لیکن۔۔۔۔ اس وقت سارا شاید یہ نہیں جانتی تھی کہ ایک دن اس کی نظموں کو پڑھتا ہوا وقت حیرت میں آجائے گا۔۔۔۔

شاعری کی تاریخ میں سارا کی نظمیں ایک کنواری ماں کی حیرتیں ہیں۔۔۔

چنگاریوں کا مقدر

سارا کا پہلا خط جو مجھے ۱۹۸۰ء میں ملا' اس پر ۲۹ ستمبر کی تاریخ تھی لکھا تھا۔ ۔ ۔

امرتا باجی! میرے تمام سورج آپ کے۔
میرے پرندوں کی شام بھی چرالی گئی ہے۔ آج دکھ بھی روٹھ گیا ہے۔ کہتے ہیں' فیصلے کبھی فاصلوں کے سپرد مت کرنا۔
میں نے تو فاصلہ آج تک نہیں دیکھا۔
یہ کیسی آوازیں ہیں۔ جیسے رات جلے کپڑوں میں گھوم رہی ہیں۔ ۔ ۔
جیسے قبر پہ کوئی آنکھ رکھ گیا ہو۔ ۔ ۔ ۔
میں دیوار کے قریب میلوں چلی' اور انسانوں سے آزاد ہو گئی۔ ۔ ۔
میرا نام کوئی نہیں جانتا۔ ۔ ۔ دشمن اتنے وسیع کیوں ہو گئے
میں عورت ۔ ۔ اپنے چاند میں آسمان کا پیوند کیوں لگاؤں
سنگ میل نے کس کا انتظار کیا
عورت رات میں رچ گئی ہے امرتا باجی!
آخر خدا اپنے من میں کیوں نہیں رہتا!
آگ پورے بدن کو چھو گئی ہے
سنگ میل' میلوں چلتا ہے اور ساکت ہے۔ ۔ ۔
میں اپنی آگ میں ایک چاند رکھتی ہوں
اور ننگی آنکھ سے مرد کماتی ہوں۔
لیکن میری رات مجھ سے پہلے جاگ گئی ہے۔
میں آسمان بیچ کر چاند نہیں کماتی۔ ۔ ۔

خط ہاتھ میں پکڑا رہ گیا۔ - - خط اردو میں تھا اور میں آسانی سے پڑھ نہیں پا رہی تھی اس لئے امروز کی مدد سے پڑھ رہی تھی۔ - - میں نے خط پر ہاتھ رکھ دیا ' امروز سے کہا۔ ٹھہرو اور نہیں۔ - - -

اور وہ لڑکی۔ - - جو کہہ رہی تھی "میں آسمان بیچ کر چاند نہیں کماتی"۔ - - میری رگوں میں اترنے لگی۔

یوں لگا۔ - - - آسمان فروشوں کی اس دنیا میں یہ سارا نام کی لڑکی کہاں سے آگئی؟ آگئی ہے تو اس دنیا میں کیسے جئے گی؟ چاہا اسے دل میں چھپا لوں۔ - - -

امروز نے آہستہ سے میرے ہاتھ کو سرکا دیا اور خط پڑھنے لگے۔

"قدم قدم پر گھونگھٹ کی فرمائش ہے۔ لیکن میرے نزدیک شرم ایک اندھیرا ہے۔ "

یاد آیا۔ - - سارا کی ایک نظم میں ٹھیک ایسی اندھیرے کی تفصیل ہے۔ "شرم کیا ہوتی ہے عورت! شرم مری ہوئی غیرت ہوتی ہے۔"

امروز خط پڑھ رہے تھے۔ - - - - -

"جسم کے علاوہ میں شعر بھی کہتی ہوں۔ شہوت میں مرے ہوئے لوگ مجھے داد دیتے ہیں تو میرے گناہ جل اٹھتے ہیں۔

دھوپ میں آگ لگی' کپڑے کہاں سکھاؤں' چنگاریوں کے مقدر میں آگ ضرور لگتی ہے۔ - - - - -

امرتا باجی! دل بہت اداس ہے' سو آپ سے بات کرلی۔ آج کل میرے پاس دیواریں ہیں اور وقت ہے۔ ہم نے تو آپ کی محبت میں کنارے گنوا دیئے اور سمندر کی حامی بھرلی۔ - - - - -

موسم کی قید میں میرا لباس کیوں رہے! میں صدیوں کی ماں ہوں۔ میری رات میں داغ صرف چاند کا ہے۔ - - -

آنکھیں مجھے کیوں ناپتی ہیں؟ کیا انسان کے جسم میں ہی سارے راز رہ گئے؟

دعا زہر ہو جائے تو خداوند کے یہاں بیٹا ہوتا ہے' اور میرے دکھ پر خداوند نے کہا کہ میں تنہا ہوں۔

مٹی بولی لگاتی ہے موسم کی۔ سچ ہے کائنات کے خاتمے پر جو چیز رہ جائے گی' وہ صرف وقت ہوگا۔

میں اپنے رب کا خیال ہوں' اور مری ہوئی ہوں۔ ۔ ۔ ۔"

میں نے تڑپ کے خط کو ایک طرف رکھ دیا۔اور جس طرح تڑپ کر اپنے کو کہا کرتی ہوں۔ ۔ ۔ "آؤ امرتا۔ میرے پاس آؤ"۔ ۔ ۔ ۔ اسی طرح کہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "آؤ سارا۔ میرے پاس آؤ۔اس وقت سارا کی ایک نظم کاغذ سے اتر کر میرے ذہن میں سلگنے لگی۔ ۔ ۔

ابھی عورت نے صرف رونا ہی سیکھا ہے۔
ابھی پیڑوں نے پھولوں ی مکاری ہی سیکھی ہے۔
ابھی کناروں نے صرف سمندروں کو لوٹنا ہی سیکھا ہے۔
عورت اپنے آنسوؤں سے وضو کرلیتی ہے۔
میرے لفظوں نے کبھی وضو نہیں کیا۔
اور رات خدا نے مجھے سلام کیا۔ ۔ ۔ ۔

اور اس وقت میرے منہ سے نکلا۔ ۔ ۔ ۔ دیکھو سارا! آج خدا سے مل کر میں تمہیں سلام کہتی ہوں۔

جھانجھر کی عورت

سارا شگفتہ کی نظم کا ایک جلتا ہوا ٹکڑا میرے سامنے تھا۔

"یہاں تو قید کی کڑیاں کھولتے کھولتے میرا بدن اٹکنے لگا ہے
ہر نقاد' غیر نقاد میرے بدن میں بھونکنا چاہتا ہے
پھر اپنے سانس جتنا کفن میرے لئے الاپتا ہے
میرا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ میں عورت ہوں
جب ان کے ساتھ تمغہ نہیں لگاتی
وہ میرے خلاف ہوجاتے ہیں۔۔۔۔
اور قطار میں لگے ہوئے لوگ مجھے بتاتے ہیں
کہ کتنے کوزے پیاس ہے
حد تو یہ ہے کہ بتانے والا۔۔۔۔
شرم کے جھوٹن سے پیالے کو دھوتا ہے
میں ایسے فاحشہ نہیں ہوسکتی
اور وہ ختنہ سے زیادہ وسیع نہیں ہوتے۔۔۔۔
پردہ؟
میں کس کس پرچم کے بند کھولوں
کیا عورت کا بدن سے زیادہ کوئی وطن نہیں؟"

لگا تاریخ دو ہی لفظوں سے واقف ہے۔ ایک وطن پرستی لفظ سے اور ایک وطن فروشی لفظ سے۔ جس میں سے ایک لفظ کو وہ عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور دوسرے لفظ کو حقارت کی نگاہ سے اور لگا۔۔۔۔۔ سارا کی نظم' یہ جلتا ہوا ٹکڑا' ایک جلتے ہوئے سوال

کی طرح تاریخ کے سامنے کھڑا ہے کہ جن کے پیروں تلے کی زمین چرا کر' ان کے بدن کو ہی ان کا وطن قرار دے دیا جاتا ہے' تم ان کی بات کب کرو گی؟

تاریخ خاموش تھی۔ اور میں عورت کی داستان کی بے زبانی میں کھوئی ہوئی تھی کہ اتنے میں سارا کی نظم کا ایک ٹکڑا میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میری تحریروں سے کئی گھروں نے مجھے تھوک دیا ہے
لیکن۔ ۔ ۔ ۔ میں ان کا ذائقہ نہیں بن سکتی
میں ٹوٹی دستکیں جھولی میں بھر رہی ہوں
ایسا لگتا ہے پانی میں کیل ٹھونک رہی ہوں
ہر چیز بہہ جائے گی۔ ۔ میرے لفظ' میری عورت
یہ مشرقی گولی کس نے چلائی ہے امرتا باجی
زبان ایک نوالہ کیوں قبول کرتی ہے؟
بھوک ایک۔ ۔ اور پکوان الگ الگ
دیکھنے کے لئے صرف چاند ستارے کیوں دیکھوں
سمندر کے لئے لہر ضروری ہے
عورت کے لئے زمین ضروری ہے
وہ بیاہنے والے لوگ کہاں گئے
یہ کوئی گھر ہے؟
کہ عورت اور عزت میں کوئی فرق نہیں ہو رہا۔ ۔ ۔ ۔
میں نے بغاوت کی ہے' اکیلی نے
اب اکیلے آنگن میں رہتی ہوں
کہ آزادی سے بڑا کوئی پیشہ نہیں
دیکھ! میری مزدوری' چن رہی ہو اونچے ماس؟
لکھ رہی ہوں
کبھی میں دیواروں میں چنی گئی
کبھی بستر میں چنی جاتی ہوں۔ ۔ ۔ ۔

--○--

یاد آیا۔۔۔۔ جب سارا سے ملاقات ہوئی تھی' (وہ ہندوستان ۱۹۸۰ء میں آئی تھی) کہنے لگی۔۔۔ امرتا باجی! میں نے دور دور تک عورت کو سوئے ہوئے دیکھا ہے اور جانا کہ سوئی ہوئی آنکھ کو جو ثواب پیش کیا جاتا ہے' میں اس کی قائل نہیں ہوں۔ جاگتی آنکھ جھوٹا پانی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ عورت جھوٹا پانی پئے۔۔۔۔۔

میں نے بیچ میں ٹوک دیا تھا۔۔۔۔ سارا! جاگتی آنکھ سے تیری کیا مراد ہے؟ جاگتی آنکھ تو روح کی آگہی ہوتی ہے۔

وہ ہنس سی دی تھی۔ کہنے لگی اس وقت جاگتی آنکھ سے میری مراد شوہر سے ہے۔ لیکن امرتا باجی! تم ٹھیک کہتی ہو' وہی شوہر جو سوئی آنکھ کا خواب تھا اگر جاگتی آنکھ میں آگہی نہ ہوتی تو وہ جھوٹا پانی کیسے لگتا۔۔۔۔ میں نے جب سوئی آنکھ کے ثواب سے آنکھ کھولی تو گھونگھٹ میں ٹوٹے ہوئے چاند دیکھے۔۔۔۔۔ دیکھا کہ مہندی نے میرے ہاتھ رنگے نہیں تھے بلکہ اور سفید کردیئے تھے۔۔۔۔ سامنے گھر نہیں تھا خالی میدان تھا اور میں میدان میں جھانجھر ڈال کر نہیں چل سکتی تھی۔۔۔۔

ایسے لگا جیسے میرے سفید کپڑوں پر رنگین دھاگوں سے میرا کفن سل گیا ہے۔۔۔۔ زخموں کو سینے کی بات تو سنی تھی' لیکن دیکھا کہ میری کھلی آنکھوں کو سینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔۔۔۔ میں نے اسی گھونگھٹ میں اپنے بچپن کے اور جوانی کے پیرہن جلا دیئے۔

میں نے کہا۔ طلاق بیچ بیچ جھانجھر کی موت ہوتی ہے۔۔۔۔

وہ پھر ہنس سی دی' کہنے لگی۔۔۔۔ اور گناہ بھی' لیکن میں اپنے گناہوں کو اپنی آیتیں سمجھتی ہوں' مگر لوگ میری نظم کو صرف ایک طوائف سمجھتے ہیں۔۔۔

میرے منہ سے نکلا۔ خدایا! نظم کو طوائف سمجھنے والوں کے لئے کیا کہوں؟

وہ بولی۔۔۔ میں انہیں خدا کی مری ہوئی تخلیق کہوں گی۔۔۔ خدا کا مرا ہوا تصور۔۔۔؟ اگر نظم کو طوائف کہا اور سمجھا جاسکتا ہے تو چاہوں گی میری بیٹی بھی۔۔۔۔ میری بیٹی مجھے نظم سی پیاری ہے اور نظم اپنی بیٹی سی۔۔۔۔

حالانکہ میری بیٹی مجھ سے چھین لی گئی ہے۔ یہ قانونی فیصلہ نہیں تھا۔ بیٹی کے باپ نے ہاتھ میں قرآن پاک لے کر مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ عید کے بعد بیٹی لوٹا دوں گا۔۔۔۔ اس نے لوٹائی نہیں اب قرآن کو آزما رہی ہوں کہ وہ اپنی عظمت کب دکھائے گا؟

اس واقعہ کی تفصیل اس نے بعد میں لکھی' ۱۹۸۲ء میں۔۔۔۔

"گھونگھٹ میں روئی سا چہرہ رکھے ساری بہنیں انسان جننے چلی گئیں۔ میں بھی چودھویں برس میں گھونگھٹ برد ہوئی اور تین برس کی مشقت سے تین بچے جنے----
بیوی کیا تھی' میں تو اجازت تھی' پہلے ماں کی اجازت سے ایک روپیہ ادھار مانگا کرتی تھی اور اب شوہر کی اجازت سے ایک روپیہ خرچ کیا کرتی تھی۔ یہ سہولت بھی کیا کم تھی۔
شوہر صاحب بھی ایک جاہل اوباش آدمی تھے۔ میں سوچتی کہ گھر والے تو کہتے تھے کہ سب کچھ تمہارا یہی ہے--- پھر وہ میرا کیوں نہیں تھا؟
جاہل اتنا کہ بات بات پر مار پیٹ اور وہ بھی اتنی کے میرے جسم پر نیل پڑ جاتے اور جب چاہتا جانوروں کی طرح ہم بستری کرتا۔ جیسے میں ربڑ کی گڑیا ہوں۔
خیر یہ تو کوئی بڑی بات نہیں۔ ہمارے یہاں کا شوہر ایسا ہی ہوتا ہے اور بیوی کو تو ایسا ہونا ہی ہے۔ خیر دن کٹتے رہے میں برقعہ اوڑھے دو بچوں کو انگلی تھمائے سوچا کرتی---
پوتڑوں کے رنگ سبزیوں سے ملتے جلتے ہیں----
ایک بچے کو دودھ پلاتی اور باقی دو بچوں کو ڈانٹتی اب تم روٹی کھا سکتے ہو"--- اب میں سبزی یوں خریدتی کہ چونی بچ رہے اور جب کافی چونیاں جمع ہوگئیں تو میں نے کلاس نہم کی کتابیں خرید لیں اور پڑھنا شروع کردیا۔ نویں پاس کی تو شوہر کے مار کے باوجود فیملی پلاننگ میں نوکری کرلی--- اب بچوں کو دیکھتی' گھر کا کام کرتی' نوکری پر جاتی اور پھر بچوں کو سلا کر میٹرک کی تیاری کرتی' جب مجھے خبر ہوئی---- میرا شوہر اور بھی بہت سی عورتوں میں پھنسا ہوا ہے تو میری اس وقت کی کنواری سوچ نے بہت برا مانا تھا۔ حالانکہ مجھے برا نہیں ماننا چاہیے تھا کسی کو قید نہیں کیا جاسکتا---
لیکن ایک روز میری بھانجی میرے گھر پر آکر ٹھہری اس وقت میرا چھوٹا بیٹا سات سال کا تھا---

وہ رات----- وہ رات---- آدھی رات کو دوسرے کمرے سے آواز آئی--- آنٹی! آنٹی!---- میں نے دیکھا میرا شوہر زبردستی میری بھانجی کے ساتھ ہم بستر ہونا چاہتا تھا میں بھاگ کر اپنے کمرے میں گئی اور اپنی ایک سالہ بیٹی کو اٹھا لائی اور کہا۔ سونا ہے تو اپنی بیٹی کے ساتھ سو۔ تم کسی کی زندگی برباد نہیں کرسکتے۔
اسی رات مجھے طلاق ہوگئی۔

انسانی صحیفہ کی آرزو

میں نہیں جانتی کہ کبھی سارا نے بھی میری طرح اس عدالت کی تمنا کی ہوگی یا نہیں جس عدالت میں کوئی نظم گواہی دے سکے۔ میں نے ضرور کی ہے۔۔۔۔

صرف تمنا نہیں کی، تصور میں ایک عدالت بھی تعمیر کرلی اور دیکھا۔۔۔۔ گواہ کے کٹہرے میں سارا کی نظم کھڑی ہے اور کہہ رہی ہے۔۔۔۔

اگر انگلی کاٹ کر سوال پوچھا جائے گا

تو جواب بے پور ہوگا۔

سنو!

میں عبادت کے لئے غار نہیں انسان چاہتی ہوں

اور تلاوت کے لئے انسانی صحیفہ۔۔۔۔

میرے اس تصور کی آنکھیں بھر آتیں جب یاد آتا کہ ایک دن انسانی صحیفہ کی آیت جیسی سارا کو اس دنیا کی ایک عدالت میں کہنا پڑا۔۔۔۔ "جج صاحب، یہ شخص بالکل سچ بولتا ہے۔ میں آوارہ بھی ہوں اور بدچلن بھی۔ اس لئے اقبال کرتی ہوں کہ یہ بچے اس شخص کے نہیں ہیں۔ ان بچوں کا باپ کوئی دوسرا ہے۔ عدالت مجھے اجازت دے کہ میں یہ بچے ان کے اصل والد تک پہنچا سکوں۔۔۔۔"

اور جتنے بھی الزام سارا پر لگائے گئے تھے، سارا نے وہ سب پہن لئے تو عدالت کی طرف سے سارا کو اپنے بچے مل گئے۔۔۔۔

اور وہی بچے، قرآن پر ہاتھ رکھ کر جب ان کے باپ نے کچھ دنوں کے لئے مانگ لئے تو پھر واپس نہیں کئے۔۔۔۔

اور کسی بھی عدالت کا انصاف کبھی نہیں جان پائے گا کہ تلاوت کے لئے سارا انسانی

صحیفہ کیوں چاہتی تھی۔ ۔ ۔ ۔

اور وہ عدالت کہیں نہیں' جو سارا کی نظم کو ایک مقدس گواہی مان لے۔ اور مان لے کہ ایسی نظم لکھنے والی آوارہ نہیں ہو سکتی' بد اخلاق نہیں ہو سکتی۔ ۔ ۔ ۔ اس کے اخلاق کی گواہی کون دیکھے گا جس کی نظم کی تڑپ کہتی ہے۔ ۔ ۔ ۔

میں اپنے ازار بند سے جس مرد کا قد ناپ لوں
پھر بھلا جسم کو کیسے داؤ پر لگا دوں

انسانی صحیفہ کی آرزو کرنے والی سارا نے اپنے خون کی روشنائی سے لکھا۔

"اس گھر میں تین برس رہی۔ ساس بوٹیاں گن کر رکھا کرتی تھی۔ مگر گھر سے قدم باہر نکالنا نہیں جانتی تھی۔ اول تو برقعہ پہنا کرتی' تنہا باہر نہیں نکلا کرتی تھی۔

اسی گھر کا ایک واقعہ یاد آیا ہے۔ تقریباً" رات کے آٹھ بجے میرے بھائی نے مجھے آکر اطلاع دی کہ والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔ میں جنازہ میں شرکت کے لئے تیاری کرنے لگی۔

میرے شوہر نے کہا۔ تم جنازہ میں شریک نہیں ہو سکتیں۔ آج انسان نہیں ایک کتا مرگیا ہے۔ ۔ ۔ ۔

میں نے کہا۔ ۔ ۔ ۔ زیادہ خباثت کی ضرورت نہیں۔ ۔ ۔ ۔ میں تو ضرور جاؤں گی۔

پھر اس نے پائپ سے مجھے اتنا مارا کہ میں بے ہوش ہوگئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو رات کے دو بج رہے تھے۔ ۔ ۔ ۔

میں نے دیوار پھلانگی اور بھاگتی ہوئی اپنے والد کے جنازہ تک پہونچی اور میت سے لپٹ کر رونے لگی۔ ۔ ۔ ۔ ۔

گھر واپس آئی ۔ شوہر صاحب نے مجھے پھر پائپ سے مارا۔

میں ہی کیا' پوری سوسائٹی عورت کے ساتھ یہی سلوک کرتی ہے۔ بس کہیں کہیں دوپٹوں کا رنگ بدل جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔

ہم تو بن آس کی آنکھیں ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور کہتے ہیں کہ عورت تو کھیتیاں ہوتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان سے پوچھو۔ ۔ کبھی کسی کسان نے اپنی کھیتی کو اجاڑا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کسان کی تو پوری زندگی کا دارومدار کھیتی پر ہوتا ہے۔"

سماج کے معزز لوگوں پر سارا ایک قدیمی عورت کی طرح پہلے ہنسی اور پھر روئی اس نے معزز لوگوں کو مخاطب ہو کر لکھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آپ کے سفید کپڑوں پر کبھی موسم نہیں آتا
صرف کچھ سفید داغ بوڑھے ہو جاتے ہیں
تمہارے اقراروں میں ڈوبے ہوئے انکاروں نے
میرا خدا مار دیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور اس نظم کے علاوہ اس نے مجھے تفصیل سے لکھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"جب وہ پہلی بار مجھ سے بچے چھین کر لے گیا تھا' میانوالی' تو میں حد سے زیادہ پریشان ہوئی تھی۔ میں اکیلی میانوالی پہونچی۔ انجان راستے' عجیب عجیب طرح کے لوگ اور میرے پاس ایڈریس تک نہیں تھا۔ اتنا پتہ تھا کہ چشمہ بیراج کے قریب گھر ہے۔ میں پہلے تو چشمہ بیراج کے کنارے کھڑی ہو گئی اور کہا۔ ۔ ۔ ۔ اے بیراج! تو تو میرے ساتھ ہے نا۔ آج میرے لئے تم دعا کرنا' آج میں کوئی دعا نہیں مانگوں گی کہ مائیں دعاؤں سے بڑی ہوتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پھر بڑی مشکل سے گھر ملا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا اندر سے میرا شوہر نکلا۔ کتیا! تو یہاں بھی پہونچ گئی ہے۔

میں نے کہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں یزید! میں یہاں بھی پہونچ گئی۔ ۔ ۔ ۔

کس لئے آئی ہو؟

مجھے میرا حق مہر دو اور میرے بچے دو!

تم اس قابل کہاں ہو کہ تمہیں حق مہر دیا جائے اور بچے تو تمہیں دیکھنے تک کا حق نہیں دوں گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں نے کہا۔ ۔ ۔ اچھا! اور میں حق مہر اور بچے وصول کر کے رہوں گی۔ میں پھر آؤں گی۔ ۔ ۔ ۔

رات بہت ہو چکی تھی۔ رہنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی' اتفاق سے ایک آخری بس مل گئی اس پر سوار ہو گئی کیونکہ میانوالی میں نہ کوئی رکشہ چلتا ہے نہ کوئی اور سواری۔ ۔ ۔

راستہ میں بس خراب ہو گئی بس میں صرف میں ہی اکیلی عورت تھی۔ میں سوچنے لگی۔

---اب میں کہاں جاؤں؟ بارش بہت ہو رہی ہے----

یہ جگہ ایک دیہات تھی۔ مجھے ایک مزدور نظر آیا میں نے اسے بلایا اور کہا۔ یہاں کوئی قریبی ریلوے اسٹیشن ہے؟

اس نے کہا - وہ تو یہاں سے تین میل کے فاصلہ پر ہے۔

میں نے کہا۔ میں تمہیں پچاس روپے دوں گی تم مجھے اسٹیشن تک چھوڑ آؤ۔

اس نے حیرت سے کہا۔ آپ شہری لڑکی اتنی دور تک پیدل چل سکیں گی؟

پھر ہم چلتے چلتے اسٹیشن تک پہونچ ہی گئے۔ اسٹیشن پر بہت سناٹا تھا کوئی بھی نہیں تھا اور خبر گرم یہ تھی کہ اس علاقہ میں لوگ دن دھاڑے عورتوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں اور پانچ سو روپے کی خاطر انسان کو قتل بھی کر دیتے ہیں----

میں ریسٹ ہاؤس کے اندر چلی گئی اور اندر سے کنڈی لگا دی مجھے کوئی ڈر خوف محسوس نہیں ہوا۔ میں نے اپنے کاغذ نکالے اور لکھنے بیٹھ گئی۔

کراچی پہونچی۔ شوہر نے جو مکان میرے نام کیا تھا اب منکر تھا اسے بڑی مشکلوں سے خالی کروایا اور ایک لاکھ روپے میں اسے فروخت کردیا۔ رقم بریف کیس میں رکھی اور میانوالی کا ٹکٹ کٹوایا----

ہوائی جہاز میں صرف ڈیڑھ گھنٹہ لگا۔ میانوالی جا پہنچی ' دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے کہا۔ اندر آجاؤ۔

رقم میں ایک ہوٹل میں رکھ آئی تھی۔ میں نے کہا---- شوہر صاحب! میں نے تم سے دگنا حق مہر وصول کرلیا ہے۔

وہ مسکراتا ہوا اٹھا اور جیسے ہی میں نے آنگن میں قدم رکھا' دو آدمی تھے اور دونوں کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور وہ مجھ پر تانے کھڑے تھے----

شوہر نے کہا---- رقم کہاں ہے؟

میں نے کہا----- سودے بازی کرلو۔ رقم لے لو اور بچے دے دو!

وہ بولا----- یہ تمہاری بھول ہے۔ شرافت سے رقم دے دو' ورنہ تمہارا جسم ابھی گولیوں سے چھلنی کردوں گا-----

میرے بچے میرے ارد گرد گھوم رہے تھے لیکن میں انہیں پیار بھی نہیں کرسکتی تھی۔ ان میں سے ایک آدمی ذرا چونکا تو میں دروازہ سے باہر نکل گئی اور میدان میں تیزی سے

بھاگنے لگی۔ - - -

گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی کبھی کوئی سنسناتی میرے دائیں اور کبھی بائیں اور کبھی سر سے گذر جاتی۔ اتنے میں ایک جیپ رکی اور کسی نے مجھے اٹھا کر گاڑی میں پھینک دیا اور جیپ تیزی سے چلنے لگی۔

مجھے اور کوئی دکھ نہیں تھا سوائے اس کے کہ کاش میں اپنے بچوں کو گلے سے لگا سکتی- - - - -

میں رو رہی تھی کہ اچانک میرے سر پر کسی نے ہاتھ رکھا- - - بیٹی! میں چونکی میں نے دیکھا- - - مجھے بچانے والا ایک میجر ہے میں نے اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ میجر نے میری رام کہانی سننے کے بعد کہا- - - - بیٹی! ہم دیہاتی لوگ اولاد سے زیادہ عزت کو اہمیت دیتے ہیں۔ تم کیوں ذلیل ہوتی ہو!

اور میں خاموشی سے عزت- - عزت - - عزت - - کو دہراتی رہی- - -

گجرے کے تین پھول

سارا کی نظم کا ایک ٹکڑا ڈاک سے ملا، ۲۲ مئی ۱۹۸۱ء کا لکھا ہوا اور پتہ کی جگہ لکھا ہوا تھا، لیاقت اسپتال کراچی۔ ----

کیا سارا اسپتال میں ہے؟

میں ٹھیک سے اردو پڑھ نہیں پاتی۔ ایک اندازے سے سارا کا نام پڑھا اور اسپتال کا نام اور لگا۔ ---- نظم کے حروف میری آنکھوں میں پانی کا قطرہ قطرہ ہو رہے ہیں۔ ---

چپ چاپ نظم والا کاغذ امروز کی طرف بڑھا دیا، لیکن دیکھا۔ --- ان کے ہاتھ میں بھی ایک کاغذ ہے دوسرے لفافے سے نکلا ہوا جسے پڑھتے ہوئے ان کا چہرہ اتر گیا۔ ---

وہ بولے۔ ----- یہ سارا کا خط ہے ۲۳ مئی کا لکھا ہوا۔ ----- وہ لیاقت اسپتال میں ہے ---- لکھتی ہے۔ ----

"امرتا! بہت بیمار ہوں، الیکٹرک سے علاج ہو رہا ہے۔ اعصاب پر بہت برا اثر پڑا ہے۔ کبھی کبھی ہاتھ کانپتے ہیں۔ زبان کانپتی ہے۔ اب شاید جسم بھی معذوری کی حالت میں ہے۔ وارڈ میں کوئی کسی سے نہیں مل رہا۔ سب بچھڑ رہے ہیں۔ میں ہاتھ پسارے خاموش بیٹھی ہوں۔ ---

اماں بتاتی ہیں کہ جب مجھے دورہ پڑا تو بے ہوش ہو گئی۔ اس کے بعد چیخیں ماریں اور چار روز تک کسی کو پہچانتی نہیں تھی۔ رات کو ٹہلنا اور بہت بہت ٹہلنا۔ ---- اور تو اور راستہ بھولنے لگی ہوں۔ چہرے بھولنے لگی ہوں اشعار لکھتے ہوئی کہتی ہوں۔ --- جانے کیا لکھنے بیٹھی تھی اور کیا لکھ رہی ہوں۔ ---"

رپورٹ پڑھی تو دماغی رپورٹ پر لکھا تھا۔ --- آئندہ دورہ خطرناک ہو سکتا ہے۔ --

دو منٹ تو جانے مجھے کیسا لگا۔ ہر چیز کو غور سے دیکھنے لگی۔
یہ کیسی دائی آئی ہے کہ درد ہی نہیں ہوا۔۔۔۔
ابھی تو مجھے لکھنا تھا۔۔۔۔
موت کی میں نے بہت چغلی کھائی ہے
پھر تو یہ حق پر ہے۔۔۔۔
لیکن یہ کیا فائدہ ہے کہ میرے حواس کھوئے جا رہے ہیں
ہاتھ گم گیا تو الوداع کیسے کہوں گی۔
ہر دروازہ پر دستک دیتا ہے وہ کالا فقیر
اور اگر پاگل ہو گئی' تو لوگ الزام کہاں رکھا کریں گے؟
میرے کتبہ پر خاموشیاں لکھ دینا
خاموشی میں سچ اور جھوٹ کا کیا سوال
ابھی تو میں نے لکھنا شروع کیا تھا
یہ کیسے ہوا۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔
اوقات کی پکی ہوں اس لئے زخمی ہوں
میرے ہاتھ فائدہ اٹھانے کے قابل نہیں تھے
کیا ایسے ہی لوگ فراموش کر دیئے جاتے ہیں؟
یا تو راستہ جاہل رہا ہو گا
یا میرا قدم جاہل رہا ہو گا۔۔۔
لیکن۔۔۔۔ ادھوری شکست بہت بری ہوتی ہے۔
دیکھو! لوگ آدھا آدھا ہاتھ میرے ہاتھ میں چھوڑ گئے ہیں
ہر بچہ کو گود لینا میری ہی تو عادت تھی
ہر سوار کی گرد دھونا ہی تو میرا سفر تھا
کانٹے کی ہنسی میرا ہی تو جنگل تھا۔۔۔
کمرے میں ایک کالی بلی گھوم رہی ہے
امرتا! یہ بلی مجھ سے زیادہ آواز رکھتی ہے

میں تو ڈر گئی' لیکن وہ بہت مغرور تھی---

سارے مریضوں کی توجہ ہٹائی ہوئی۔

وارڈ بوائے نے پاگل سمجھ کر مجھے چھیڑا---

پیدل تو سبھی لوگ چلتے رہے ہوتے ہیں' دیکھنا تو یہ گرا کون ہے؟

وحشت ہو رہی ہے۔ دیواریں آنکھوں سے چنی جاتیں تو اور وحشت ہوتی----

------

ٹھنڈی ٹھار قبر کا سوال کر رہی ہوں

یا تو میں روؤں گی یا میری قبر روئے گی

آدھی بات کہہ رہی ہوں' آدھی بات آپ نے کہنی ہے

ذہن دکھ رسیدہ ہو رہا ہے' ڈاکٹر نے لکھنے سے منع کیا ہے---

گھر والے بھی منع کرتے ہیں----

وہ ہاتھ اور قلم کا نحو نہیں جانتے

کالا آدمی جب آئے گا' کہہ دوں گی

میری جوتی تم نہ اتارو! میں خود ہی اتاروں گی---

پھر وہ میرا حساب لے گا اور میں اپنی کتاب دے دوں گی----

جس دن مٹی میں ڈول گئی' آسمان کے ہاتھ سے

عرش گر جائے گا----

میں نے اتنی نیکیاں بسر کی ہیں جتنی بار کہ قرآن میں شیطان کا ذکر ہے--

آسمان اور زمین میں کتنا فرق ہے

کتبوں والے نماز تو پڑھتے ہی نہیں---

سو' سوا نیزے کے بعد انسان رہے گا

یہ ساری آگ کوڑے کرکٹ پر لگی ہے

بتاؤ! بے وقوفی کے بھی ہاتھ بڑھے! لمبے قدم کے چھوٹے پاؤں---

موت کے چٹخارے لینے والا غفور الرحیم ہے

جیسی کٹیا ویسی چھاؤں۔۔۔۔
پھر انسان سے مہنگا تو راز ہوا
غیب کی لاٹھی سے ہمیں باندھا گیا ہے۔۔۔۔
سفر کھیلا جا رہا ہے' لیکن گیند کو نہیں دہرا سکتے
پہلے تو آنکھ کے کان کتروں گی کہ وہ زیادہ کیوں سنتی ہے!
کوئیں کی پیاس رسی نہیں' زمین بجھاتی ہے
اس قدر لوگ مرے! پر موجوں کی چوری سے سمندر
کون سے دبلا ہو جائے گا۔۔۔۔
درد ہو رہا ہے' اٹھ کر دوا کھالوں
زندہ رہی تو پھر آؤں گی۔۔۔۔۔

تمہاری - سارا شگفتہ

خط سنا تو میری آواز تڑپ گئی۔۔ سارا! ہو گا وہ کوئی سمندر جو لہروں کی چوری سے دبلا نہیں ہوتا۔۔۔۔ لیکن دوستی اور محبت کا میرا سمندر تیری جیسی لہر کی چوری سے سوکھ جائے گا۔۔۔۔

اس وقت میرے سمندر میں ایک طوفان برپا ہوا۔ یہ کیسے اسپتال ہیں۔ جہاں مریض کو پاگل سمجھ کر چھیڑنے والے' اسپتال کے کارکن پاگل قرار نہیں دیئے جاتے۔۔۔

امروز کی آواز اس طوفان پر طاری ہو گئی۔ وہ سارا کی نظم پڑھ رہے تھے۔

میرے تینوں پھول پیاسے ہیں۔۔۔۔
میری ماں کے آنسو اب زمین پر گرنے لگے ہیں
اور لوگ بے تحاشہ چننے لگے ہیں
میرے پاس موت کے اور بھی سات روز ہیں
ان سات دنوں کو میں پرو نہیں سکتی
الوداع کیا ہوتی ہے
کہ میرا ہاتھ رکنے والا ہے
میری قمیض کے دھاگوں سے داستانیں لکھی جائیں گی
رونا نہیں!

کہ میرا لہو بہت اداس تھا
میں آخری لفظ سے دوڑ جاؤں گی--- قاعدہ رکھنے کے لئے
جب میری قبر کا چہرہ ہو جائے
تو ناخون تک کو زندہ رکھنا!
میرے کتبہ پر پھولوں کو دہرانا مت
کہ لانا تو لفظوں کا گلدستہ لانا
اڑ جانے والی آنکھیں کہیں نہ کہیں برس رہی ہوتی ہیں
پاگل میں نہیں تھی، اس کا قدم تھا
جو میرے لہو میں داخل ہو گیا تھا
کاش میں آنکھیں تمہیں باندھ کر دے سکتی
کہ سب سے زیادہ فضول خرچ آنکھیں ہوتی ہیں
وہ مجھ میں چلتا رہا، چلتا رہا
اور میں سنگ میل بن گئی
موت کے سکے چل نکلیں تو خاموش رہنا
مٹی جاگتی ہے-------
اس سے پہلے کہ میں مٹی میں رچ جاؤں
میرے ساتھ انصاف کرنا!
میرے راستوں کی بھول مجھے معاف کرنا!
کوئیں میں ڈولتی رسی جل تو سکتی ہے
پیاس نہیں بجھا سکتی
اور جلنا بجھنا، جلنا بجھنا
تو خدا کے تیوہار ہیں----
زندگی تو پہلے سے روٹھی ہوئی تھی
اب تو صرف خدا پر الزام لگانے جاؤں گی---
وہ پوچھے گا------- تمہیں کس ناپ کی جوتی آتی ہے؟
وہ سمندر بن کر سوال کرے گا

میں چٹکی بن اسے محدود کردوں گی
مٹی اور خدا میرے جسم سے کھیلیں گے
اور میں کم سے کم بولوں گی
کہ ٹوٹے ہوئے کھلونے کبھی کبھی پاؤں میں چبھ جاتے ہیں----
خدا نے موت کا قد ناپا تو وہ خود شمار ہو جائے گا----
میں نے تمہارے لئے سفید پیرہن پر کڑھائی کی ہے
سوئی یا تو پیرہن میں رہ گئی' یا مجھ میں
کس کس کے ہاتھوں پر آنکھیں رکھ دوں
اور کس کس کو الوداع نہ کہوں
میری طرح بکو گے؟
میں نے بہت ہنسی بانٹی ہے
یہ میرے ہونٹوں سے کیسے گر گئے
سچ ہے---- میری گری ہوئی آنکھوں پر بھی
لوگوں نے قدم رکھے اور سنور گئے------
کون میرے نام کی روٹی دیکھ کر بھوکا رہتا ہے!
کون مجھے کندھا دے کر گذر جاتا ہے
میرے گجرے کے تین پھول پیاسے ہیں-----

نظم سنتے ہی میرے ذہن میں قدیم باشندوں کی ایک کہانی کروٹ لینے لگی کہ یہ جو آسمان میں گرجتے بادل ہوتے ہیں' یہ چھوٹے چھوٹے بچوں کی روحوں کا قید خانہ ہوتے ہیں' جہاں وہ بادلوں میں بلکتے ہیں' زمین پر دیکھتے رہتے ہیں کہ انہیں کسی ماں کی کوکھ کب ملے گی-----

لگا ------ سارا کے گجرے کے تین پیاسے پھول---- ضرور سارا کے تین بچے ہیں جو اس سے چھن گئے ہیں---- انہیں ماں کی کوکھ ملی پر ماں کی گود نہیں مل سکی-----

اور جو بچے میں نے کبھی دیکھے نہیں---- وہ پانی کے بھرے بادلوں میں بلکتے ہوئے بھی دکھنے لگے اور اسی میری زمین پر' کسی گھر میں پڑے سوکھے ہوئے پھولوں کی صورت میں

بھی----

سارا کی نظم ایک تڑپتی ہوئی کوکھ کا درد تھی جسے لوگ پاگل قرار دے رہے تھے۔
یہ نظم نہیں' ایک سوئی تھی' جو بچوں کے سفید پیرہن پر کڑھائی کرتے کرتے آدھی سارا کے ہاتھ میں اتر گئی تھی اور آدھی بچوں کے پیرہن میں سل گئی تھی----
اسی ٹوٹی ہوئی سوئی کا درد بعد میں ۱۹۸۲ء میں سارا نے اپنے قلم سے لکھ کر مجھے بھیجا ----

"ضمیر سے لے کر بے ضمیری تک کا سفر بھی میرا ہی ہے۔ میرا ہی تو چہرہ ہے۔ طلاق کے بعد میں ماں کے گھر نہیں گئی' بلکہ ایک بیوہ عورت کا ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔ کچھ کتابیں تھیں میرے پاس' ڈگری کے لئے' اور ایک چادر تک نہیں تھی----
اس عظیم بیوہ نے ایک تو مجھے بستر دیا' یہ تو ہر فقیر کو مل جاتا ہے۔ لیکن اس کی سب سے عظیم بات یہ تھی کہ اس نے ایک اکیلی عورت کو مکان کرائے پر دیا جو کہ عام طور پر اکیلی عورت کو نہیں ملتا-----
انہوں نے بچے مجھ سے چھین لئے تھے' میں روز گھر کی جھری میں سے جھانک کر بچوں کو دیکھ کر واپس آجاتی تھی' میرا ہر عذاب زمین پر بستا رہا۔ میں تین انسان جننے کے بعد بھی اکیلی ہوئی' تو مٹی سے زیادہ بھوکی نکلی-----
رات سے پہلے چاند نکل آئے تو روگ لگتا ہے۔ سورج اپنے پنجے سمیٹ رہا تھا جیسے اکیلی دعا خدا ڈھونڈنے نکلی ہو----
آنکھوں کی کینچلی سے میرا لباس سیا جاتا تھا۔ دکھ بھی نابینا ہونے لگا۔ قافلے کی گھنٹیاں اکیلی عورت کو اتنا ڈراتی ہیں کہ خوف پتھر ہونے لگتا ہے-----

صبح دودھ دینے نہیں آتی
دوپہر روٹی نہیں مانگتی
آنکھوں جیسی کالی رات بھوک کو نابینا کرتی ہے۔

خواہش کی پہلی گھڑی میرے ٹانکے کھولتی ہے اور میرے کپڑوں کا رنگ پاگل ہوجاتا ہے-----

راستوں کی آدھی جوتی سے میری عورت کے پیر ننگے رہنے لگے۔
بینائی کے تابوت میں میخیں ٹھونک دی گئیں۔

میرے دکھ کی پرانی قبر پر روز نئی مٹی ڈالی جاتی کہ انسان اس سے زیادہ موت کو یاد نہیں کرسکتا۔۔۔۔

میری زبان کھلونے بناتی اور میرے لہو سے پتنگیں اڑاتی لیکن میرے بچوں کے پاس ڈور نہیں تھی۔ ان کے کپڑوں سے سورج نے ضد چرا لی تھی۔ بچوں کے پاس سورج کا آخری رنگ بھی نہیں۔۔۔۔۔ اور پھر بچوں کی ہتھیلی پر سورج کا لہو رہ گیا۔۔۔۔۔

آواز۔۔۔۔ سوئی کی زبان کی طرح میرا لہو تانکنے لگی

صبر۔۔۔۔۔ گھن کی طرح میرے چاند کو دیکھتا

کشتی کے ڈوبنے سے کبھی سورج چھوٹا ہوا ہے؟

سو بچوں کا آدم ابھی بھی مہذب ہے۔۔۔۔

میں جب بچوں سے ملنے جاتی تو دیکھتی کہ بچے بہت ڈرے ڈرے سے ہیں اور مجھ سے بات نہیں کرتے۔ وہ بچوں کو اتنا مارتا اور اتنا ڈراتا کہ مجھے اپنے سہمے ہوئے بچے دیکھ کر بہت افسوس ہوتا۔ ان کے دلوں میں یہ بات ڈال دی گئی کہ تمہاری ماں آوارہ ہے' بدمعاش ہے اور غیر مردوں کے ساتھ تصویر کھنچواتی ہے۔

میرے سامنے۔۔۔۔ میرے بچے' اپنی سوتیلی ماں سے بہت پیار کرتے۔ ایک بچے کو میں بہلا پھسلا کر ایک الگ کمرہ میں لے گئی اور کہا۔۔۔۔ بیٹا! مجھے ایک بار ماں کہدے!

اس نے ماں نہیں کہا۔

پھر تو میری ہچکیاں بندھ گئیں اور وہ ڈر کے مارے کمرے میں بھاگ گیا۔

دو سال تک کٹہرے میں جا کر کھڑی ہوتی رہی۔

تاریخ پڑی۔۔۔ ایک کٹہرے میں میں اور دوسرے میں بچوں کا باپ کھڑا تھا۔ وہ بولا۔

جج صاحب! میری بیوی بدچلن ہے۔دوسرے مردوں کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔۔۔۔

جج نے پھر مجھ سے کہا۔ بیان دو۔

میں نے کہا۔۔۔۔ جج صاحب یہ شخص بالکل سچ بول رہا ہے' میں آوارہ بھی ہوں اور بدچلن بھی اس لئے اقبال کرتی ہوں کہ یہ بچے اس شخص کے نہیں ہیں۔ ان بچوں کا باپ کوئی دوسرا ہے۔ عدالت مجھے اس بات کی اجازت دے کہ یہ بچے ان کے اصلی والد

تک پہنچا سکوں۔ بچوں کا باپ یہ نہیں ہے اس لئے ان بچوں پر اس شخص کا کوئی حق نہیں ہے۔

فیصلہ میرے حق میں ہوگیا۔ میں پولیس کے ساتھ گئی اور بچے برآمد کرا کے کراچی چلی آئی۔

اتنے عرصہ میں بچے باپ سے مانوس ہو چکے تھے اور اپنے باپ کو یاد کرتے تھے۔ مجھے بہت دکھ ہوتا تھا خیر کچھ دن کے بعد بچے مجھ سے مانوس ہوگئے میں نے بچوں کو اسکول میں داخل کروا دیا۔

اور مینا بازار میں ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان کھول لی۔ بچے اسکول سے سیدھے دکان پر آجاتے اور میں دکان پر ہی بچوں کو پڑھایا کرتی۔

ایک روز میرے دروازہ پر بچوں کا باپ آیا۔ میرے ضمیر نے گوارا نہیں کیا کہ اسے عزت نہ دوں۔ بڑی خوش دلی سے اسے اوپر آنے کی دعوت دی اور کہا۔ آخر تم میرے بچوں کے باپ ہو۔ آؤ بچوں سے مل لو۔

وہ اوپر فلیٹ پر آگیا میں نے بچوں کو کمرے میں تنہا چھوڑ دیا اور کھانا پکایا اور باقی بھی تھوڑا بہت اہتمام کیا۔

میں کمرے میں چائے لینے گئی تو اس کے ہاتھوں میں قرآن تھا اس نے قرآن اٹھا کر کہا۔ چند روز کے لئے بچے مجھے دے دو چند روز کے بعد میں واپس کرجاؤں گا۔ دیکھو' میں نے قرآن اٹھا رکھا ہے اور اگر اس کے باوجود کوئی قانونی چارہ جوئی کرنی ہو تو وہ بھی کرلو۔

میں نے کہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب تم نے قرآن ہی اٹھا لیا ہے تو باقی قانونی چارہ جوئی کس کام کی۔ مجھے قرآن پر اعتبار ہے۔

امرتا! میں خود بچوں کو جہاز پر سوار کروانے گئی اور انہیں الوداع کہا۔

کافی ماہ گذر گئے وہ بچوں کو واپس لے کر نہیں آیا۔ دو سال ہونے کو آئے ہیں اور نہ میں ملاقات کرنے گئی اب مجھے دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کیا فیصلہ کرتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

امرتا! میں جب کبھی بچوں کو یاد کرتی ہوں تو میرے پستانوں سے دودھ بہنے لگتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ بات معجزہ سے کم نہیں۔ میں اپنے بچوں سے بے انتہا محبت کرتی ہوں جب ان کا نام لیتی ہوں تو میری کوکھ میں درد ہونے لگتا ہے۔ ۔ ۔ ۔

ساری ساری رات تونے چاند کو دیکھتی رہتی ہوں اور سوچتی رہتی ہوں کہ یہ آدھا

چاند کہاں چھپ جاتا ہے ------
بچوں کو یاد کرتی ہوں تو لہو کے ٹانکوں سے میرا دل پھٹ جاتا ہے۔
گھڑی کی ذندہ ٹک ٹک مجھے مردہ کر رہی ہے ----
موت کو قریب سے دیکھ رہی ہوں۔
ہر کروٹ پر خالی چادر ہاتھ آتی ہے ----
میں کسی سے نفرت نہیں کر سکتی۔
اپنی آنکھیں فروخت کروں یا اپنے ہاتھ فروخت کروں!
انسان کو انسان ہونے کا معاوضہ ضرور دیتی ہوں۔

میں نے اس شہر کو ماں کی طرح پالا ہے اور آدھی رات کو بھی اگر کوئی بھی میرا دروازہ کھٹکھٹائے تو سارا شگفتہ اپنے گھر سے نکل کھڑی ہوتی ہے۔

میری محبت اور میرے ایثار کو لوگ ہمیشہ غلط ذہن دیتے رہے ----
پھر بھی میں اپنی ہنسی کے تھان میں لپٹی اپنی قبا کے تار نکالتی رہی۔

دودھ کی قسم

آسٹریلیا کے قدیم باشندوں میں ایک کہانی کہی جاتی ہے کہ ایک وقت تھا جب بطخوں کے پر سفید ہوتے تھے۔ لیکن ایک بار ایسا طوفان برپا ہوا کہ بطخوں نے ایک ایسے گھونسلے میں پناہ لے لی جو در اصل چیلوں کا گھونسلہ تھا۔ بڑی بڑی چیلیں جب اپنے گھونسلوں میں آئیں تو بطخوں کو دیکھ کر انہیں بری طرح سے کاٹنے پیٹنے لگیں اتنا کہ ان کے سفید پر بھی نوچ لئے اور انھوں نے ادھ مری بطخوں کو اپنے بڑے بڑے پنجوں میں لے کر دور ایک جنگل میں پھینک دیا۔۔۔۔

مری سی بطخوں کو ہوش آیا تو دیکھا۔ اب ان کے بدن پر پر نہیں تھے۔۔۔۔۔ وہ وہیں زمیں پر تڑپنے لگیں۔ اس وقت کچھ کوے اڑتے ہوئے آئے اور بطخوں کی داستان سن کر کہنے لگے۔ وہ بڑی بڑی خوفناک چیلیں ہماری بھی دشمن ہیں اس لئے ان سے بدلہ لینا ہی ہوگا۔۔۔۔ اور ہم انہیں دکھا دیں گے کہ بطخیں زندہ ہیں۔

"بطخوں کو زندہ رکھنا ہی پڑے گا۔۔۔۔۔ یہ سوچ کر بہت سے کوؤں نے اپنے کالے پر اپنے بدن سے اتارے اور بطخوں کو دے دیئے۔۔۔۔۔ یہی واقعہ تھا کہ آسٹریلیا کی بطخیں آج تک کالے پروں والی ہیں۔

میں سارا کی بھیجی ہوئی ایک نظم پڑھ رہی تھی اور میرے ذہن میں آدی واسیوں کی کہانی کے کوے بطخوں کو تسکین دے کر انہیں اپنے کالے پر دیتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔۔۔۔

نظم تھی۔۔۔۔۔۔۔۔

تم شاعر تھے۔۔۔۔

میں طوائف ہوتے ہوئے ایک جھونپڑی میں بیاہی گئی

اور میرا بچہ بے کفن مر گیا۔ ۔ ۔ ۔
طوائف ہوتے ہوئے میں تمہیں کما نہ سکی
کہ کھوٹے سکے میری چھاتیوں سے بہہ نکلے
اور تو بارات ہار گیا
چار برس میں آدمی چارپائی بنتی رہی
اور تو میری شرم گاہ میں سوتا رہا
میں ایک مشرقی طوائف ہوں
اس لئے مغرب تک تمہیں ' تیرا کمیشن دلاتی
میں ماں اس لئے نہیں کہ تیرا خلاص صرف مشرق ہے
تم موت نہیں بھولتے' میں دکھ نہیں بھولتی
میری شرم گاہ میں کون سا کھوٹا سکہ چل نکلا
کہ جہاں بھی چاہوں تجھے خرید سکتی ہوں
تیرا خلاص کفن پر ہوتا ہے
اور میرا طوائفی جنم انسان سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
میں نے ناچ ناچ کر جھانجھر کھو دی
تو نے خاموش رہ رہ کر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
حرام زادوں نے تو حد کر دی
عورت کو محض خلاص کا وسیلہ سمجھا گیا۔ ۔ ۔
آج مجھے خبر ہوئی کہ میں تو تیری داشتہ تھی
اور تیرے سارے ہی لفظ دلے ہو گئے۔ ۔ ۔ ۔
میں نے تم سے کبھی حق مہر نہیں مانگا
میں اتنی طوائف زادی ہوں
کہ میرا حق مہر لوگ یوں ہی دے دیتے ہیں
تیری تھکاوٹ۔ ۔ ۔ ۔ یہ شہر جانتا ہے
تیرے ہاتھ پمفلٹ ہو گئے۔ ۔ ۔ ۔
تیری تلوار اور تیری سپہ سالاری

اس وقت کہاں تھی
جب چار ہیجڑوں کے اقرار پر میں تیری آبرو تھی----
تیری غیرت تو مردہ بچہ قبول نہیں کرتی---
میری ٹوٹن کو کیسے قبول کرے گی!
میرا آخری مرد مرگیا ہے
جس سے میں آج تک بیاہی ہوئی تھی
اب میری چوڑیوں کے نیزے بن گئے ہیں
جن سے میں اپنی داستان لکھوں گی----

○

اور سارا نے وہ داستان لکھ کر مجھے ایک خط کی صورت میں بھیجی----

امرتا! تمہیں روز تنگ کرنے آجاتی ہوں' لیکن پھر کہاں جاؤں۔ یہ تو میں نے تمہیں بتایا ہی نہیں کہ میں نے شاعری کیسے شروع کی-----

آج سے پانچ برس پہلے' کہنے کو ایک شاعر' میرے ساتھ فیملی پلاننگ میں سروس کرتا تھا۔ میں بہت بانماز ہوتی تھی۔ گھر سے آفس تک کا راستہ بڑی مشکل سے یاد کیا تھا اور پڑھنے لکھنے کا بالکل شوق نہیں تھا۔ اتنا ضرور پتہ تھا کہ شاعر لوگ بڑے بڑے لوگ ہوتے ہیں------

ایک شام شاعر صاحب نے کہا۔ مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔ پھر ایک ریستوران میں ملاقات ہوئی۔ اس نے کہا---- شادی کرو گی؟

دوسری ملاقات میں شادی طے ہوگئی۔

اب قاضی کے لئے پیسے نہیں تھے۔ میں نے کہا آدھی فیس تم قرض لو' آدھی فیس میں قرض لے لیتی ہوں۔

چونکہ میرے گھر والے شریک نہیں ہوں گے میری طرف سے گواہ بھی لیتے آنا۔ ایک دوست سے میں نے ادھار کپڑے مانگے اور مقررہ جگہ پر پہونچ گئی اور نکاح ہوگیا قاضی صاحب نے فیس کے علاوہ مٹھائی کا ڈبہ بھی منگوا لیا تو ہمارے پاس چھ روپے بچے۔ باقی جھونپڑی پر پہونچے تو دو روپے بچے۔

میں لالٹین کی روشنی میں گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی تھی۔--- شاعر نے کہا۔

دو روپے ہوں گے؟ باہر میرے دوست کرایہ کے بغیر بیٹھے ہیں۔ میں نے دو روپے دے دیئے۔

اس نے پھر کہا۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے یہاں بیوی نوکری نہیں کرتی۔

نوکری سے بھی ہاتھ دھوئے۔

گھر میں روز تعلیم یافتہ شاعر اور نقاد آتے اور ایلیٹ کی طرح بولتے۔

میرے خمیر میں علم کی وحشت تو تھی ہی' لیکن اس کے باوجود بھوک برداشت نہ ہوتی۔ روز گھر میں فلسفے پکتے اور ہم منطق بگھارتے۔

ایک روز جھونپڑی سے بھی نکال دیئے گئے۔ وہ بھی پرائی تھی' ایک آدھا مکان کرایہ پر لیا۔ میں چٹائی پر لیٹی دیواریں گنا کرتی اور اپنی جہل کا اکثر شکار رہتی۔

مجھے ساتواں مہینہ ہوا۔ میرے درد شدید تھا۔ علم کے غرور میں وہ آنکھ جھپکے بغیر چلا گیا۔ جب اور درد شدید ہوا تو مالک مکان میری چیخیں سنتی ہوئی آئی اور مجھے ہسپتال چھوڑ آئی۔ میرے ہاتھ میں درد اور پانچ کڑکڑاتے نوٹ تھے۔

تھوڑی دیر بعد لڑکا ہوا۔ سردی شدید تھی اور ایک تولیہ بھی بچے کو لپیٹنے کے لئے نہیں تھا۔

ڈاکٹر نے بچے کو میرے برابر سٹریچر پر لٹایا۔

پانچ منٹ کے لئے بچے نے آنکھیں کھولیں اور کفن کمانے چلا گیا۔

بس' جب سے میرے جسم میں آنکھیں بھری ہوئی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سسٹر مجھے وارڈ میں لٹا گئی۔ میں نے سسٹر سے کہا۔ میں گھر جانا چاہتی ہوں کیونکہ گھر میں کسی کو علم نہیں۔ اس نے مجھے بے باکی سے دیکھا اور کہا۔ تمہارے جسم میں زہر پھیلنے کا ویسے بھی ڈر ہے۔ تم بستر پر رہو۔

لیکن اب آرام تو کہیں بھی نہیں تھا۔ ۔ ۔ ۔

اب میرے پاس مردہ بچہ اور پانچ روپے تھے۔ میں نے سسٹر سے کہا۔ میرے پاس فیس کے پیسے نہیں ہیں۔ میں لے کر آتی ہوں۔ میرے لئے اب مشکل ہے ہسپتال میں رہنا۔ تمہارے پاس میرا مردہ بچہ امانت ہے۔ میں پیسے لے کر آتی ہوں۔ بھاگوں گی نہیں۔

میں سیڑھیوں سے اتر گئی مجھے ایک سو پانچ ڈگری بخار تھا بس پر سوار ہوگئی' گھر پہنچی' میرے پستانوں سے دودھ بہہ رہا تھا۔ میں نے دودھ گلاس میں بھر کر رکھ دیا۔

اتنے میں شاعر اور باقی منشی حضرات تشریف لائے۔ میں نے شاعر سے کہا۔ لڑکا پیدا ہوا تھا' مر گیا ہے-----

اس نے سرسری سنا اور اپنے نقادوں کو بتایا' کمرہ میں دو منٹ خاموشی رہی اور تیسرے منٹ گفتگو شروع ہو گئی۔

----- فرائڈ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟

----- راں بو کیا کہتا ہے؟

----- سعدی نے کیا کہا؟

----- اور وارث شاہ بہت بڑا آدمی تھا-----

یہ باتیں تو میں روز ہی سنتی تھی لیکن آج لفظ کچھ زیادہ ہی صاف سنائی دے رہے تھے' مجھے ایسا لگا۔ جیسے' یہ سارے بڑے لوگ میرے لہو میں ہوں اور راں بو اور فرائڈ میرے رحم سے میرا بچہ نوچ رہے ہوں۔

جانتی ہو امرتا! اس روز علم میرے لہو میں قہقہے لگا رہا تھا۔ اس روز علم میرے گھر میں پہلی بار آیا تھا۔ میرے بچے کا جنم دیکھو! چنانچہ ایک گھنٹہ گفتگو رہی اور خاموشی آنکھیں لگائے مجھے دیکھتی رہی۔

وہ لوگ علم کے نالے عبور کرتے کمرے سے جدا ہو گئے۔

میں سیڑھیوں سے ایک چیخ کی طرح اتری-----

اب میرے ہاتھ میں تین روپے تھے-----

میں اپنی ایک دوست کے ہاں پہونچی اور تین سو روپے قرض مانگے۔ اس نے دے دیئے پھر اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ کیا تمہاری طبیعت خراب ہے۔ ؟

بس مجھے ذرا سا بخار ہے۔ میں زیادہ دیر رک نہیں سکتی کہ پیسے کسی قرض خواہ کو دینے ہیں۔ وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا-----

ہسپتال پونچی' بل ۲۹۵ روپے کا بنا اب میرے پاس پھر مردہ بچہ اور پانچ روپے تھے۔

میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ آپ لوگ چندہ اکٹھا کر کے بچے کو کفن دیں اور اس کی قبر کہیں بھی بنا دیں۔

بچے کی اصل قبر تو میرے دل میں بن چکی ہے-----

میں پھر دوہری چیخ کے ساتھ سیڑھیوں سے اتری۔ ننگے پیر سڑک پہ دوڑتی ہوئی بس

میں سوار ہوئی۔ ڈاکٹر نے سمجھا شاید صدمے سے میں ذہنی توازن کھو بیٹھی ہوں۔

کنڈکٹر نے مجھ سے ٹکٹ نہیں مانگا چونکہ میرے کپڑوں سے خون چھلک پڑا تھا۔

میں بس سے اتری اور کنڈکٹر کے ہاتھ میں پانچ روپے رکھتے ہوئے چل نکلی۔

گھر؟ گھر!!! گھر پہونچی-----

گلاس میں دودھ رکھا ہوا تھا۔ کفن سے بھی زیادہ اجلا----

میں نے اپنے دودھ کی قسم کھائی---- شعر میں لکھوں گی! شاعری میں کروں گی! میں شاعرہ کہلواؤں گی!

اور دودھ باسی ہونے سے پہلے ہی میں نے ایک نظم لکھ لی۔

لیکن تیسری بات جھوٹ تھی مجھے کوئی شاعرہ نہ کہے۔ شاید میں کبھی اپنے بچے کو کفن دے سکوں۔

امرتا! آج چاروں طرف سے شاعرہ شاعرہ کی آوازیں آتی ہیں! لیکن ابھی تک کفن کے پیسے پورے نہیں ہوئے------

میں پھر بھی اس بے حس انگارے پر لیٹتی رہی' اور وہ مجھے زہر مار کرتا رہا۔ میں نے اسے کبھی نہیں کہا کہ تمہارے کرنے سے' میرے بدن سے' ایک روح بچھڑ گئی ہے---

میں خدا سے زیادہ خاموش رہی-----

جب وہ میرے ساتھ سوتا' ایسے لگتا' جیسے میرا پھر کوئی بے کفن بچہ مرنے والا ہے-- ----

چیلوں' کوؤں اور بطخوں کی کہانی' خدا جانے کتنی لمبی ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ یہ کہانی کب اور کس دور میں انسان کی نسل پر نازل ہوگئی-------

میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ سارا کی روح سفید پروں جیسی خوبصورت تھی اور ان سفید پروں کو نوچ نوچ کر اسے کالی گالیوں کے کالے پر دے دیئے گئے------

ایک اور اینٹ

میں گھر ناچی ہوں تو اینٹ ہاتھ آتی ہے۔۔۔۔۔
اور سارا نے اس اینٹ کی داستان لکھ کر مجھے بھیجی۔۔۔۔
"میں نے قرض لے کر ایک انڈسٹریل ہوم کھولا۔ چونکہ شاعر صاحب کی تنخواہ کو میں نے کبھی دیکھا نہ تھا' سوچتی تھی۔۔۔۔ اس لیے ایندھن کے ساتھ دن گذار دوں گی۔۔
کہ اچانک ایک واقعہ پیش آیا۔ شاعر صاحب اپنے ایک دوست شاعر کو گھر لائے اور تعارف کروایا اور کہا۔ اب تو میری بیوی بھی شاعری کرتی ہے۔۔۔
خیر' میں کام سے فارغ ہو کر شام کو گھر آتی اور شام تک کافی ادیب شاعر آجاتے اور مقابلہ بازی ہوتی رہتی۔
چھ ماہ یوں ہی گذر گئے۔۔۔۔
ایک شام دوست شاعر صاحب تشریف لائے اور بولے۔ مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔ لیکن پہلے آپ قسم اٹھائیں کہ برا نہیں مانیں گی۔۔۔۔
بہت ضد کے بعد میں نے قسم اٹھالی۔ اس نے کہا۔
میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔
میں نے کہا۔۔۔۔۔ میں شادی شدہ ہوں۔ بھلا میری اور تمہاری شادی کیسے ہو سکتی ہے؟ اور آئندہ سے مجھے یہ بات مت کرنا۔
خیر' بات کو میں نے ہنسی میں ٹال دیا۔ ایک میری دوست تھی' وہ بھی ہمارے گھر آتی تھی۔ وہ حضرت کی نگاہ بھانپ گئی۔ ایک روز مجھ سے مذاق میں کہنے لگی۔ سارا تمہیں وہ شاعر کیسا لگتا ہے؟

میں بھی موڈ میں تھی ہنس کر کہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا ہے' خوبصورت ہے۔ اسمارٹ ہے۔
۔ ۔ ۔ اور پھر ہم دوسری باتیں کرنے لگیں۔

ایک روز میں انڈسٹریل ہوم سے واپس آئی تو میرے شوہر شاعر کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ دوسرا شاعر بھی موجود تھا۔ ویسے بھی شام کو ہم سب لوگ اکٹھے ہوتے تھے۔ میں کرسی پر بیٹھی تھی کہ میرے شوہر نے قرآن شریف میرے ہاتھوں میں رکھ دیا۔ دوسرا شاعر بھی موجود اور کچھ لوگ بھی موجود تھے۔

وہ بولا۔۔۔۔۔۔ تمہارے ہاتھوں میں قرآن ہے۔ امید ہے تم سچ بولو گی۔

میں نے کہا۔۔۔۔۔۔ قرآن نہ ہوتا تو بھی سچ بولتی۔ خیر پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو۔

بولا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا تم نے اپنی دوست سے کہا تھا کہ یہ دوسرا شاعر خوبصورت ہے اسمارٹ ہے اور مجھے اچھا لگتا ہے۔ ؟

میں نے کہا۔۔۔۔۔۔۔۔ ہاں' میں نے کہا تھا۔

تو پھر بولا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے تمہیں طلاق دیا' طلاق دیا' طلاق دیا۔ جب طلاق دے چکا اور قرآن ابھی تک میرے ہاتھوں میں تھا۔ میں نے کہا۔ تم مجھے طلاق دے چکے ؟

اس نے کہا۔۔۔۔۔۔۔ ہاں۔

تو پھر میں نے کہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری بھی اب سن لو۔ میں اس قرآن کو ہاتھوں میں رکھ کر کہتی ہوں کہ اس شاعر کے ساتھ میرا کوئی ناجائز تعلق نہیں ہے۔ لیکن تم گھٹیا اور کمینے انسان نکلے۔ اس گھر کے دو دروازے ہیں اب ایک سے تم باہر نکل جاؤ یا دوسرے سے میں نکل جاتی ہوں۔۔۔۔۔۔

وہ فوراً" میرے قدموں میں گر گیا اور کہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے معاف کردو! تمہاری جیسی بیوی مجھے نہیں مل سکتی۔۔۔۔۔

میں نے کہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں تمہیں تھوک چکی ۔ اب میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں۔ اسی چکر میں رات کے دو بج گئے۔ دوسرا شاعر بھی بیٹھا ہوا تھا۔ میں اپنے کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد کمرے میں پہلا شاعر آیا اور بڑی منتیں کیں میں نے اسے کمرے سے نکال دیا۔ پھر دوسرا شاعر کمرہ میں آگیا میں نے اسے بھی کمرہ سے نکال دیا۔

خیر' صبح ہوئی' میں نے مکان کرایہ پر لے لیا اور اکیلی رہنے لگی۔

اب دوسرا شاعر میرے پیچھے کہ میری وجہ سے تمہیں طلاق ہوئی ہے۔ مجھ سے شادی

کرو ورنہ میں خود کشی کرلوں گا۔

میں نے کہا۔ ـ ـ ـ ـ ـ یہ سب مکر ہے' جھوٹ ہے' جاؤ اپنا کام کرو!

اب وہ میرے فلیٹ کے نیچے پہروں دھوپ میں کھڑا رہتا اور شہر کے معزز لوگوں کے پاس جا کر کہتا کہ میری اس سے شادی کروا دیں۔

چھ ماہ گزر گئے۔ سننے میں یہی آتا کہ آج وہ فلاں کے پاس گیا اور آج فلاں کے پاس اور بہت روتا ہے۔ پھر ایک روز میں نے اسے بلایا اور بہت سمجھایا کہ اب میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں۔

لیکن وہ اڑا رہا۔ میں نے اسے اتنا تک کہا کہ اگر مجھے چاہتا ہی ہے تو شادی کی کیا ضرورت ہے۔

وہ نہیں مانا۔

ایک روز پھر میں نے پوچھا۔ کیا تم صرف شادی کرنا چاہتے ہو۔

اس نے کہا ـ ـ ـ ـ ـ ہاں۔

تو میں نے کہا ـ ـ ـ ـ جاؤ! سارے شہر میں کارڈ چھپوا کر تقسیم کردو اور پرسوں بارات لے کر آجاؤ ۔ شادی ہوگئی۔

صبح ساس صاحبہ فرمانے لگیں۔ کیا ٹیکا نتھ لگائے ہوئے بیٹھی ہو' میرے کنوارے لڑکے کو پھانس لیا ـ ـ ـ ـ

میں نے خاموشی سے ٹیکا نتھ اتار کر رکھ دیا اور دوسرے کپڑے پہن لئے۔ شادی کے پہلے روز شاعر صاحب فرمانے لگے تم اکیلی باہر آجا نہیں سکتیں۔ یہ ہمارے گھروں کا دستور ہے۔

مجھے پڑوس تک جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ـ ـ ـ ـ

شادی کے ایک ہفتہ بعد ساس' نندوں کی نفرتوں کی وجہ سے شاعر صاحب نے مجھے اتنا مارا کہ مجھے زمین پر لٹا کر میرے سینے پر کودنے لگا۔ ـ ـ ـ

مجھے کسی سے ملنے جلنے کی اجازت نہیں تھی میرے ہر آنے والوں پر شک کیا جاتا تھا۔ میں تمام گھر والوں کے کپڑے دھوتی' بوٹ پالش کرتی۔

چھ نندیں مجھے مل کر گالیاں نکالتیں اور شوہر صاحب تو ایسے بدلے کہ جیسے لونڈی خرید کر لائے ہوں۔

ایک روز اس کی والدہ نے کہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم نے مجھ سے میرا بیٹا چھین لیا ہے۔

میں نے کہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ماں جی! آپ بالکل فکر مند نہ ہوں میں آپ کو آپ کا بیٹا واپس کروں گی۔

پھر شام میں نے شام کو سب کو اکٹھا کیا اور شاعر صاحب سے کہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے اسی وقت طلاق چاہیے۔

اس نے کہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ طلاق نہیں دوں گا۔ میں تو تمہاری کھال ادھیڑ دوں گا۔ اور دروازہ پر تالا ڈال دیا گیا۔

میں پھر امید سے ہوگئی۔ میرے لئے یہ بات بڑی پریشان کن تھی باہر بھی جا نہیں سکتی تھی اور بن مانس نے میرے پاؤں چاٹ چاٹ کر کاغذ کے کر دیے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وہ مجھے چھوتا تو مجھے ایسا لگتا جیسے میرے دل میں کوئی زنجیر اتر گئی ہو۔

ایک روز میں نے ایک بڑے سے کاغذ پر لکھا۔ ۔ ۔ ۔ میں بچہ ضائع کروانے جا رہی ہوں میں نہیں چاہتی کہ تمہارا گندہ خون میری رگوں میں دوڑے۔

اور صبح پانچ بجے دیوار پھلانگ کر ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس پہنچ گئی اور بچہ ضائع کروا دیا۔

مجھے بہت تیز بخار چڑھ گیا۔ سارا دن بستر پر لیٹی رہی۔ شام کو اٹھی اور گھر واپس آئی۔

اتنے میں میری نندوں نے تمام محلے میں شور مچا دیا کہ ہماری بہو بھاگ گئی ہے۔

پھر شوہر نے مجھے اتنا مارا کہ میرے بدن پر نیل پڑ گئے۔

پھر وہ بل ڈاگ کہنے لگا۔ جاؤ' میرے بوٹ پالش کرو' اس کے بعد چائے بناؤ۔

میں نے بوٹ پالش کئے۔ اور چائے بنائی' اس کے بعد بے ہوش ہوگئی۔ میرے لکھنے پڑھنے پر بھی پابندی تھی' میں ٹائلٹ میں جا کر شعر لکھا کرتی۔ اور کتا کہتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عظیم شاعرہ میرے بوٹ پالش کر رہی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس گھر میں مجھ پر اتنا تشدد ہوا کہ مجھ پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔

پھر ایک روز میں نے اپنی ساس سے کہا۔ میں تمہیں تمہارا بیٹا واپس کئے جا رہی ہوں۔ اس لئے میں بھی ماں ہوں اور ماں کے دکھ کو جانتی ہوں۔ اور دروازہ سے باہر نکل گئی۔

پھر بڑی مشکلوں سے میں نے طلاق حاصل کی۔"

یہ ایک اور اینٹ تھی' جو گھر کے نام پر سارا کے ہاتھ آئی-----

اور جب وہ تکئے کی جگہ سر کے نیچے یہ اینٹ رکھ کر سوئی تو کتنی ہی نظمیں کاغذوں پر اترنے لگیں----

میرے بدن میں ٹوٹے ہوئے پالنے!
میں نے تیرا کوئی نام نہیں رکھا
کہ انسانی تاریخ----
بچے کی پہلی میت سے شروع ہوتی ہے
میں سانس تک رکی---- تو ٹھہر گیا
تو میری کوکھ میں اتنا بول!
کہ ہم دونوں انسانی تاریخ لکھ سکیں---
لیکن میرے ڈیڑھ جسم کی پرچھائیں سے
ایک پالنا نہیں بنتا
میری کوکھ میں ٹوٹے ہوئے کھلونوں کی چیخیں ہیں---
صدیوں تک میرا ادھورا بچہ
کوئی نہیں ڈھونڈ سکتا-----

ایک بار سارا نے اپنے دودھ کی قسم کھائی تھی کہ وہ نظمیں لکھے گی۔ دودھ کی قسم پوری ہوئی۔ سارا نظمیں لکھتی رہی اور انہیں نظموں نے اسے انسانیت کی پہچان دی اتنی کہ شوہر کے نام پر جس مرد سے گالیاں کھاتی رہی ایک دن اس سے ہنس کر کہہ پائی ---
- میں نے گالیاں جیتی ہیں اور تو نے ہاری ہیں۔

خدا کی گلی میں

اور ۲۷ مئی ۱۹۸۸ء کی تاریخ میں سارا نے مجھے خط لکھا۔ "جب میں ہنستی ہوں تو آنکھیں مرجاتی ہیں اور زبان کفن ہوجاتی ہے۔ ـ ـ ـ ـ ـ ـ وہ دو آنکھوں سے مرے ساتھ چل رہا تھا۔ لفظوں کی شکن میرے پاس رہ جاتی ہے اور لفظ اس کے پاس' کہہ رہا تھا۔ ـ ـ ـ مجھے تم سے بہت محبت ہے۔ مجھے معاف کردو میں نے تیرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ ـ ـ ـ ـ

میں نے کہا۔ ـ ـ ـ کیا میں غیر موجودگی میں بھی موجود ہوتی ہوں؟ اور میں خوش ہوئی جیسے میرا دل ایک سکہ ہو۔

میرے چاہو کی جیب میں تو کچھ بھی نہیں' میں نفرت سے کھڑی رہی تھی اور وہ مکاری سے بڑھ رہا تھا۔ گرے ہوئے مکانوں کے ٹھاٹ باٹ دہرانے سے کیا فائدہ۔ ـ ـ ـ وہ تیرا کتا تھا۔

یہ کنجر ہاتھ مجھے اور کتنا زہریلا کریں گے۔ کھانستے کھانستے میری چھاتیاں زمین ہوگئی ہیں۔ خدایا! مجھے پہلے ہاتھوں والوں سے بچا۔

میں ان کی ہتھیلیوں پر نہیں ناچ سکتی۔

غلط ہاتھوں کی وجہ سے میری زبان پر موچ آگئی ہے۔ ـ ـ ـ

یہ دور کیوں نہیں چلے جاتے؟ بار بار مجھے کیوں کاٹتے ہیں؟

میری طاقت میں دو مٹھی زمین ہے۔ ـ ـ ـ کہاں جاؤں؟

میں رسی نہیں بننا چاہتی۔ ـ ـ ـ

اپنے بس میں رہنا چاہتی ہوں۔ ـ ـ ـ

اس آدھے خط میں مٹی کے اس بھنور کی تفصیل تھی جو پہلے' دوسرے اور تیسرے

شوہر کی صورت میں اس کے گرد تھا اور وہ ذہنی طور پر اس بھنور سے نکل نہیں پا رہی تھی۔۔۔۔۔

اس بھنور میں اس کے گھرے کے تین پھول بھی شامل تھے۔ تین بچے اور وہ بچہ بھی جو بے کفن مر گیا۔ اور وہ ادھورا بچہ بھی جس کا ٹوٹا ہوا پالنا اس کے بدن میں اٹک گیا تھا اور کچھ ٹوٹے ہوئے کھلونوں کی چیخیں اس کی کوکھ میں۔۔۔۔

یہ ہی بھنور اسے گھر کی تلاش میں کبھی دنیا کی گلیوں میں لے آتا کبھی کسی اسپتال میں لے جاتا اور کبھی خدا کی گلی میں۔

اسی خط کا دوسرا آدھا حصہ خدا سے مخاطب ہے۔۔۔۔

"سر میری ہنسی پہنے؟ اور میں کتوں کے سانس گنوں؟\
اے میرے کھوئے ہوئے خدا!\
تو کون سا اخبار اور کون سی خبر پڑھتا ہے؟\
تیرے تراشے ہوئے بت ساکت نہیں ہوتے\
ان کے پاس رکھی ہوئی دعائیں ہوتی ہیں۔۔۔۔\
میں تو ناچتے ناچتے ٹوٹ گئی ہوں\
اور دیکھتے دیکھتے روٹھ گئی ہوں\
لکیروں سے مجھے نہ کاٹ!\
کہ سیاہ دل سے سیاہ لفظ لکھے جائیں۔۔۔۔۔\
میں نے اقرار سے تختی لکھی ہے\
اور وہ مٹ رہا ہے\
تیری خاموشی سے میں کنکر کنکر ٹوٹ رہی ہوں\
جب میں بانٹی گئی' تیرے فقیر کہاں تھے؟\
کیا کہوں! جتنی تیری گلی ہے' اتنا بھونک لیتی ہوں\
اور تو ہے کہ صبر کی چٹکی بجائے چلا جاتا ہے۔۔۔"

اور یہ بھنور کئی بار اسے پہچانے ہوئے پانیوں سے نکال کر نئے پانی میں لے جاتا ہے۔

اسی خط کا آخری حصہ ہے۔

"دکھوں کی دکان پر حرام توبہ کی پڑی بکتی ہے۔۔

آخری دعا زبان سے گری تو خدا کے ہاتھ چھوٹ گئے۔۔۔
کہاں تلاش کروں؟ جانے کسے؟
ایک اندھا ٹٹول رہا تھا' میں نے پوچھا۔ بابا! سڑک کے پار جانا ہے؟ بولا۔۔۔۔ اسٹیشن جانا ہے' گاڑی میں بھیک مانگوں گا۔۔۔ میں نے اسے رکشے پر بٹھا دیا اور کہا۔۔۔ ۔ اسٹیشن تک پہونچا دیتی ہوں۔۔۔۔
امرتا! وہ رکشے میں مجھے چپکے چپکے چھیڑتا رہا اور میں جانے کیا سوچ کر خاموش رہی۔۔
کائنات میں اپنا ایک قدم رکھا ہوا ہے' اس لئے ادھوری ہوں۔۔۔۔
میں نے موت کی آنکھ پر زبان رکھ دی ہے۔
اس لئے میرا ذائقہ لوگوں کی زبان پر برا ہے
میں ذلیلوں میں نہیں رہ سکتی۔۔۔۔
میں کم ہونے پر تم پریشان مت ہونا
کہ میں نے راہ میں اپنے پیروں کو چنا۔
امروز کو سلام

تمہاری ۔ سارا شگفتہ

مسجد کی اینٹ

بھنور بڑا ہوتا چلا گیا۔۔۔۔

وہ شاعری تھی اس لئے اس کے گرد ایک اور دائرہ بھی تھا۔ شاعروں' ادیبوں اور نقادوں کا۔۔۔۔

اور وہ دائرہ بھی اس بھنور میں شامل ہوتا گیا' بھنور بنتا گیا۔

۱۹ جون ۱۹۸۱ء کی تاریخ میں لکھا ہوا سارا کا ایک خط مجھے ملا۔

امرتا۔۔۔۔ کیا لکھوں! ایک لفظ فروش کے ہاں گئی' بولا۔۔۔ سارا! بہت بیمار لگ رہی ہو!

اور مجھے لفظ ماری کو کہیں نہ کہیں تو پہونچانا ہوتا ہی ہے نا!

وہ لوگ میرے چہرے کے پاتال گننے۔۔۔۔۔۔

کہنے لگا۔۔۔۔ فلاں کی بیوی کہہ رہی تھی کہ شاعرہ تو اچھی ہے پر دوپٹہ کی سوجھ بوجھ نہیں ہے۔۔۔۔

میرا تو جنم ہی بے ترتیب ہے' لگن میں تو خالی مٹی لگی ہے۔۔۔۔

میرے نمک کا اندازہ کسی کو کیسے ہو سکتا ہے۔

کیا کہوں۔۔۔۔ گھر ناپتی ہوں تو اینٹ ہاتھ آتی ہے۔۔۔۔

موت سی مسکراہٹ آخر چہرہ رکھتی ہے۔

ایک تنہائی' دوسری کتابیں' کون سی زبان رکھتی ہیں!

آخر انسان بڑھ بھی کیسے سکتا ہے!

انسانی گارے کو ترتیب دیتے دیتے میں تو حرام زادی ہو گئی۔۔۔۔

کیا مندروں کی آواز پر جگ راتے نہیں ہوتے؟

کیا مسجدوں کی اینٹیں چرائی نہیں جاسکتیں ؟"

سارا نے اگر کسی چیز میں اپنی مشابہت پائی تو مسجد کی اینٹ میں پائی۔ پاک مسجد کی پاک اینٹ میں۔

لیکن جو ایک بہت تلخ تجربہ ہر سچے فن کار کو ہوتا ہی ہوتا ہے' وہ اسے بھی ہوا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ یہ دنیا لفظوں سے معنی چرانے والوں کی دنیا ہے۔ ۔ ۔ ۔

اور معنی چرانے والے لفظ فروش ہوتے ہیں۔ اتنے کہ "خدا" لفظ سے بھی معنی چرا کر' اس لفظ کو بیچتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔

محبت لفظ سے بھی معنی چرا کر' اس لفظ کو بیچتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔

دین' ایمان' مذہب اور ادب۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کون سا ایسا لفظ بچا ہے' جس کے معنی کو چرا کر ان لفظ فروشوں نے اسے نہ بیچا ہو۔

سارا نے ضرور اپنے لاشعور میں یہ سب دیکھ لیا ہوگا' تبھی تو باخبر ذہن سے لکھ پائی۔

۔ ۔ ۔ ۔

کیا مسجد کی اینٹیں چرائی نہیں جاسکتیں؟

وہ سچ مچ پاک مسجد کی ایک اینٹ تھی' تبھی تو کہہ پائی ۔

اپنی آنکھ کے پاس رہنے سے
کیا عورت آوارہ کہلاتی ہے؟

اور اس نے تڑپ کر خط میں لکھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"کم از کم اتنی تو ایمانداری مجھ میں ہے کہ مجھے کوئی نظر آئے تو سجدہ کرتی ہوں۔ پھر بھلا سر کے دوپٹہ کا سجدے سے کیا تعلق ؟ بس اتنی سی بات ہے' جس پر سارے شہر نے شور مچا رکھا ہے۔

کیا لکھ رہی ہوں' میں تو چل رہی ہوں۔ ۔ ۔ ۔
یہ گدلے لوگ کنول کو رکھنا نہیں جانتے
بس ان کی آنکھیں مردہ سا جواب رکھتی ہیں
پانیوں کے مقدر میں بھنور ہوتے ہیں
عورت کے مقدر میں صرف انسان ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔

اور عورت کے اس مقدر انسان نے مسجد کی اینٹ چرانے والے نے' سارا کو پھر

اسپتال کا دروازہ دکھایا۔

کراچی کے لیاقت اسپتال میں لکھی ہوئی سارا کی ایک نظم میرے پاس آئی' جس پر ۲۰ جولائی کی تاریخ تھی۔ - -

امرتا! میں سب کے چراغوں میں جلا کرتی تھی
آج پاگلوں کے قبیلے سے حاملہ ہو گئی ہوں
سلاخیں مجھے بوجھ نہیں سکتیں
سامنے سلاخوں پر تالے کی آنکھ لگی ہے
ایک عورت - - - - زنجیروں سے بجی بنی ہے
میرا سنگھار دیکھ!
دوسری نے خلا سے آنکھیں باندھ رکھی ہیں
اور تیسری عورت کی گھڑی سے وقت گر گیا ہے - - -
کیا ہوا ان کے ساتھ؟
عزت تو ماں سے دور کی بات ہے
یہاں - - - - زنجیروں کا مجرا سورج تک سنتا ہے - - - -"

یہ نظم ایک آنکھ رکھتی ہے جس طرح مسجد کی اینٹ اپنے میں خدا کی آنکھ رکھتی ہے۔ اور جس طرح شیو جی کے ماتھے پر تیسری آنکھ ہے۔

اور اس لئے یہ نظم صرف اپنے درد کی حد میں محدود نہیں رہتی' وہ بالکل بے گانے درد کو بھی چھو لیتی ہے۔ کسی اس بد نصیب عورت کے درد کو بھی جو لوہے کی زنجیروں کا زیور پہنے بیٹھی ہے۔ اور کوئی دوسری - - - - - جو زمین سے اتنی مایوس ہو چکی ہے کہ اس نے اپنی آنکھیں خلاؤں سے باندھ دی ہیں اور کوئی تیسری - - - - - - - جس کے لئے دنیا کوئی موسم' یا اپنی جوانی کوئی معنی نہیں رکھتی اور وقت اس کی گھڑی سے گر چکا ہے - - -

یہ زنجیروں کا مجرا دیکھنے کے لئے جو آنکھ چاہئے وہ کسی ذہنی مریض کے پاس نہیں ہوتی' وہ صرف انسانیت کے پاس ہوتی ہے۔ انسان کے ذہنی توازن میں' اور وہ سارا کے پاس تھی۔

اس نظم میں سارا نے لکھ پائی - - - -
جب سے جنگل جلا ہے' آگ چیزوں کا شکار نہیں کرتی

لوگ میری خاموشی سے بھی چھوٹے تھے۔
سو میں نے سمندر تقسیم کر دیا
عورتیں چیخوں سے حاملہ نظر آ رہی ہیں ----

لگا---- بچوں سے حاملہ ہونے والی عورتیں کی تاریخ میں یہ ورق صرف سارا نے لکھا ہے۔ جس پر چیخوں سے حاملہ ہونے والی عورتوں کی داستاں ہے ---

نظم کے ایک ایک حرف کو ایک آگ چھو گئی تھی۔

ہم سب خدا کو چھوڑ رہے ہیں
کیا موت آخری خدا دے گی؟
خدا نے قرآن لکھا
میں نے انسان لکھا ----

نظم پڑھتے ہوئے میرا سر سجدے میں جھک گیا۔ سامنے سارا کی صورت میں ایک مسجد تھی' ٹوٹی ہوئی مسجد ' جسکی اینٹیں لوگوں نے چرا لی تھی ---

لیکن سجدہ تو ٹوٹی ہوئی مسجد میں بھی کیا جا سکتا ہے۔

کیا ---- یہ سجدہ مسجد کو قبول ہوا۔ کیونکہ سارا کی نظم کہہ رہی تھی۔

امرتا! شکر ہے تم ہو!
پتہ پتہ چھاؤں بچھڑ رہی ہے۔
وہ سامنے ----- ہنسی سے ایک عورت مر رہی ہے
دھرتی پر بہت سے موسم رہ گئے ہیں
تم سے ملنا بھی ----
فاصلوں کی رات چراغ بانٹا نہیں کرتے
نرس سوئی سے ہانک رہی ہے اس عورت کو
زندگی کا نشان ابھی باقی ہے اس پر
کیا خبر پرندوں کو کتنا دکھ ہو پرواز کا
سلاخوں سے جھانکا تو موسم بہت تنگ نکلا
احمد سلیم ' تم اور میرے بچے

میرے ساتھ قید ہو!

میری سلاخ تھامو! اور میری قید سنو

احمد سلیم ایک بہت احسان مند شاعر ہے پاکستان کا' جس نے نفرت کی گرد سے لپٹی ہوئی سرحد پر محبت کے کتنے ہی پھول نظموں کی صورت میں بوئے اور اس محبت کے الزام میں جیل کاٹی۔ اس نے سارا کو بھی دوستی کا تحفہ دیا اور مجھے بھی۔ سارا کی نظم میں اپنے بچوں کے اور میرے نام کے ساتھ اسی کا نام ہے ----

سارا نے ٹھیک پہچانا۔ کہ اس کے ٹوٹتے تن بدن کے ساتھ ' جن کے تن بدن سے کوئی ٹکڑا ٹوٹ سکتا ہے' وہ صرف اس کے بچے ہو سکتے ہیں' یا اس کے یہ دوست ----

۱۱ جون ۱۹۸۱ء والے خط میں سارا نے یہ بھی لکھا تھا۔

" کسی دن اس جسم کی بارگاہ سے نکل جاؤں گی

تو پہ سے انصاف کون مانگتا ہے

یہ کون لوگ ہیں امرتا! جو آگ کو مٹی سے چھوٹا سمجھ رہے ہیں

میری منڈیر سے رات اور سورج اکٹھے اڑ گئے ہیں -----

طبیعت بہت خراب ہے' راستہ بھولنے لگتی ہوں ----

بس تیرے علاوہ کون ہے جس سے باتیں کہوں

سو حوصلے سے سن لیا کر!

اتنی تکلیف تو تمہیں دے ہی سکتی ہوں

میں لکھتی رہوں گی۔ موت کی دستک تک ---

میرا تقاضہ تھا کہ وہ اپنی زندگی کی داستان ' سلسلے وار اپنے قلم سے لکھے۔ جواب میں اس کا خط آیا۔

امرتا! طبیعت بہت خراب رہتی ہے۔ کہو تو خود نوشت قسط وار بھیج دیا کروں؟ اور پھر ۲۲ ستمبر ۱۹۸۱ء کی تاریخ میں خط آیا۔

امرتا! کسی وقت بھی دورہ پڑ جاتا ہے ایک مہینے سے نہیں سوئی۔ انسان اسی وقت لکھتا ہے جب اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہوتا ---

میری ابتداء بے ضمیری سے ہوئی' اس لئے تمام عمر ضمیر تلاش کرتی رہی -- بڑی مشکل سے لکھتی ہوں کچھ بھی تو نہیں تھا مرے پاس ۔ قلم کی نوک دل میں ڈبوتی ہوں اور

لاشعور لکھتی ہوں۔ اس لئے الیکٹرک کی نذر ہوتی جا رہی ہوں ----

ابھی تو میں نے قلم کو پکڑنا بھی نہیں سیکھا تھا۔ میری تختی پر لکھ دینا
مجھے کوری آنکھوں کے دیدار لکھنے ہیں ---
مجھے انسانوں سے خوف آتا ہے
میں لمبے سفر کو نکل جاؤں تو؟
انسانی صحیفہ کہاں ہے؟
ڈھونڈنا' پوچھنا اور مجھے چھاپ دینا----

تمہاری سارا شگفتہ

سارا کچھ ترتیب سے اور کچھ بے ترتیبی سے اپنی زندگی کی داستان لکھتی رہی اور مجھے بھیجتی رہی۔ وہاں پاکستان میں سارا کی کوئی نظم شائع نہیں ہو پا رہی تھی۔ یہاں ہندوستان میں میں جب بھی اس کی نظم شائع کرتی' سارا کو خوشی ہوتی ۔ اور جو ملاقات ہوئی تھی اس کو یہاں انٹرویو کی صورت میں چھپا دیکھا تو سارا کو بے حد خوشی ہوئی -----

اس کی ایک بہت بڑی آرزو تھی کہ اس کی کتاب شائع ہو اور اسی لئے وہ اپنی زندگی کی داستان لکھ کر مجھے بھیجتی رہی۔ ساتھ ہی ۱۵ نومبر ۱۹۸۱ء کی تاریخ میں اس نے مجھے خط لکھا۔

امرتا! احمد سلیم کے علاوہ پاک میں کوئی انسان نہیں جس سے دن بانٹ سکوں۔ میں اسے بہت تنگ بھی نہیں کرنا چاہتی۔ اس کے علاوہ کسی اور کے سے ملنے کو دل نہیں چاہتا تنہائی کے پیر کی تلی پر ایک خاموشی رکھے میں خود کو گن رہی ہوں۔

میرے بائیں ہاتھ کو پتہ نہیں کیا ہوگیا ہے بالکل کام نہیں کرتا --- لگتا ہے یہ بھی ضمیر بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر دائیں ہاتھ کو بھی کچھ ہوگیا تو لکھوں گی کیسے!

ویسے ڈاکٹر نے کہا ہے ۔ الیکٹرک شاک لگنے کی وجہ سے ہاتھ پر یہ اثر پڑا ہے۔ ٹھیک ہوجائے گا ----

اب تک مجھے اکیس شاک لگ چکے ہیں۔ کبھی کبھی تو گھڑی کی مقدار سے بھی زیادہ وحشت ہونے لگتی ہے۔ لیکن میں ایک پیڑ کی طرح کھڑی ہوں ---- نہ خاموش رہتی ہوں نہ چل سکتی ہوں ---

کاغذ سے بچھڑنے والے زمین سے کب بچھڑتے ہیں! لگتا ہے میں قلم اور کاغذ ہو کر

رہ گئی ہوں اور انسان بھول رہی ہوں آج میں اپنے داہنے ہاتھ کی ہتھیلی پھیلا کر۔ خود ہی بڑی روئی ---

میرا صرف ایک انٹرویو چھپا ہے اور گناہوں کی نبوت مل گئی ہے اگر مرا زندگی نامہ چھپ جائے تو کم از کم حشر کے روز میری اکیلی قبر کا اکیلا خدا ہونا چاہئے! کہیں فرشتے میری لپیٹ میں نہ آجائیں!

کیا لکھوں؟ پچھلے دنوں ایک صاحب نے کہا۔سارا تو پلید لفظ لکھتی ہے اسی لئے اس کی شہرت ہے اور مرد اسی کارن اسے داد دیتے ہیں اور کلام سنتے ہیں ----

مجھے لکھنے سے فرصت ملے تو شہرت کی طرف دیکھوں!

ایک صاحب نے کہا ---- "ادب ضمیر سے پیدا ہوتا ہے" میں نے کہا "کیونکہ میں بے ضمیری ہوں اس لئے میری نظم پر صرف بے ضمیروں کو بولنے کا حق ہے"

بتاؤ! انسان بے ضمیر ہو جائے تو لکھ نہیں سکتا؟

جن صاحبان کا ذکر سارا سامنے اس خط میں کیا' انہیں کا ذکر اس نے بعد میں جب اپنی داستان لکھی' تفصیل سے دیا۔

ایک تنقیدی بیٹھک میں ایک جملہ کچھ اس طرح تھا---- سارا! اپنے جسم میں اور اپنی شاعری میں تمیز پیدا کر!" یہ محض ایک گالی تھی میں نے برداشت کی پوری کوشش کی صرف اتنا کہا ---" صاحب! میں تو بے ضمیری لکھتی ہوں مجھے کیا معلوم کہ تمیز اور ضمیر کسے کہتے ہیں۔ اس لئے میری نظم پر صرف بے ضمیروں کو بولنے کا حق ہے۔

پھر ایک دن ایک شاعر نے کہا ---- "نماز پڑھا کرو"

حالانکہ اس کا قد جانماز سے بھی چھوٹا تھا ----

پھر ایک نقاد بولا ---- "بیٹی' یہ لچھن اچھے نہیں" اور رومال سے اپنی رال پونچھنے لگا۔

کسی اور نے کہا ---- "بن جال کی مچھلی ہے' پر میں تو بہن کہہ چکا۔ اب تم نپٹو۔"

یہ عالم' یہ گرگے' یہ کمروں کے باشندے' عزت کے پتھروں سے بوجھل' نقالوں سے تالیاں پیٹنے والے' اپنے قد سے بھی چھوٹی داد رکھتے ہیں سوسائٹی کے اعلیٰ نسلی کتوں کا یہ حال ہے ---

ننگا سورج

سارا کا خط آیا۔۔۔۔

"امرتا! سات روز پہلے میں نے سوچا۔۔۔۔ سارا بی بی! بہت ہو چکی بہت سی آنکھیں نایاب ہو چکیں۔ تھوک دے یہ جسم! تو امرتا! میں نے ایک خط تمہیں لکھا اور ایک خط اپنی رخصتی پر لکھا۔ وہ خط میں نے امی کو دیا۔ یہ رکھ لیں۔ صبح احمد سلیم آئے تو اسے دے دینا۔۔۔۔

وہ پڑھی لکھی نہیں ہیں۔ انہوں نے ازار بند سے خط باندھ لیا اور تمہیں جو خط لکھا تھا میز پر پڑا رہا۔۔۔۔۔۔ میں نے چالیس گولیاں کھائیں اور امی کے پاس سو گئی۔۔۔
آنکھ جھپکی تو دیکھا۔۔۔۔۔ جناح ہسپتال کے صرف وارڈ تک پہونچی ہوں۔
بقول امی کے۔۔۔۔۔ مجھے تین روز بعد ہوش آیا تھا۔۔۔۔۔
جسم بہت دکھ رہا تھا۔ احمد سلیم بہت ناراض ہوئے۔ خیر اداس لوگوں کی آنکھوں کی لڑیاں پہننے میں پھر کمرے میں موجود ہوں تھوڑی دیر پہلے میں نے امی سے کہا۔ امی میں نے امرتا کو جو خط لکھا تو وہ تو دے دیں۔

خیر ہوئی کہ دونوں خط امی نے اپنے ازار بند میں باندھ رکھے ہیں ایک اور گرہ گانٹھ میں باندھتے ہوئے بولیں۔ کون ہوتی ہے امرتا تیری؟ ہر وقت امرتا امرتا کہتی ہے۔۔۔۔ تو روز اسے خط لکھتی ہے' ایک خط اسے نہیں ملے گا۔ تو اس کے خزانے میں کون کمی ہو جائے گی۔۔۔۔۔۔ یہ تو ثبوت ہے' تیرا کیا بھروسہ۔۔ تو تو پاگل ہے۔ جانے کیا کر دیا ہے تجھے ان شاعروں نے' ان کالی زبان والوں نے' ارے تیری بہن تیرے ہاتھ پر انگار کوئلہ رکھتی تھی۔ تو اس کا مطلب ہے کہ تجھے اتنا لکھنے اور پڑھنے کے لئے تھوڑے رکھا تھا؟ تجھے ہو کیا گیا ہے؟ مت پڑھا کر اتنا۔۔۔۔۔ کیوں خاندان کے پیچھے پڑی ہے۔ ارے

بلی بھی سات گھر چھوڑ دیتی ہے۔ تجھے ذرا سی غیرت نہیں؟ کیا کیا باتیں لکھتی رہتی ہو! اور اس پر خود کشی کر کے بوڑھی ماں کو سلاخوں کے پیچھے رکھنا چاہتی ہو؟

ہاں امرتا! دوغلی تو دھوپ ہے' پھر پھول اتنے رنگوں میں ؟ اس وقت تو مجھے ہنسی آ رہی ہے------

امی دونوں خط ازار بند سے باندے سو چکی ہیں۔ چلو تحریر کی انہیں اتنی تو خبر ہوئی۔ ویسے ڈاک کا یہ نظام مجھے بہت اچھا لگا-----

تمہاری - سارا شگفتہ

اس خط پر کوئی تاریخ نہیں۔ جواب میں میں نے تڑپ کر جانے کیا لکھا ہو گا' پر اتنا ظاہر ہے کہ سارا سے جینے کا اقرار مانگا ہو گا تبھی اس کا خط آیا-----

امرتا! میں تم سے جینے کا وعدہ کرتی ہوں' اگر ٹمک کو پتہ نہ چلے------ دیکھو نا' روحیں سنک اڑا لے جاتا ہے' کیا رنگ رنگتا ہے یہ رنگ ساز کہ بدن کی قید جھیلنی ضرور ہوتی ہے------

تم نے جس محبت سے مجھے قید کیا ہے' اس کے لئے میرے تمام لفظ تمہارے لئے احترام میں سر جھکاتے ہیں۔

تم بھی نہیں چاہتیں کہ میں سنک کی قید سے نکلوں' تو چلو یہ تماشہ اور سہی۔

دکھوں کی دیوی ! بدن کا رنگ پھیکا پڑتا جا رہا ہے ٹمک مجھے ٹٹول رہا ہے۔ میرے اطراف خالی چیخیں چنی جا رہی ہیں۔ ایک سنک میل پر میرے سانس لکھے جا چکے ہیں اب تو ضبط پر زندہ ہوں۔

ٹمک کو ڈھونڈنے چلی تھی امرتا! تم نے بھی کہہ دیا مت جاؤ' چلو آج دیوار پر میرا اقرار نامہ لکھ دینا۔

طبیعت بہت خراب رہنے لگی ہے۔ لکھتے لکھتے لفظ بھول جاتی ہوں' کبھی تو یوں بھی ہوتا ہے کہ ہاتھ کانپ رہے ہوتے ہیں' اور جی لکھنے کو چاہ رہا ہوتا ہے پھر پتہ چلتا ہے کہ لفظ کا سینہ مجھ سے بڑا ہے۔

کافی کتوں کی آوازیں آتی ہیں---- سارا! سارا! کون ہے' جانتی ہوں۔ کتا گوشت کی دکان پر بھونک رہا ہے۔

کبھی کبھی جی چاہتا ہے۔ چلو بیوقوفیاں کروں! لیکن مصنوعی تعلق میں رکھ نہیں سکتی۔ یا

تو تعلق ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔

خدا اور بھی خاموش ہوتا جا رہا ہے----

سیکڑوں اور مردوں سے مکالمہ کرنے کی وجہ سے گھر والے بھی نفرت کرنے لگے ہیں۔

سچ کون بول رہا ہے' کوئی نہیں جانتا۔

کتاب اپریل تک چھپ رہی ہے' دیکھو پھر کیا ہوتا ہے' کسی فٹ پاتھ پر گذارہ کرنا ہوگا۔

امروز کو سلام - بچوں کو پیار

تمہاری - سارا شگفتہ

میں جانتی تھی کہ سارا کی ایک بہت بڑی تمنا ہے۔ اپنی نظموں کو کتابی صورت میں دیکھنا۔ اس لئے ایک تسلی ہوئی کہ اب اپریل میں اس کی کتاب شائع ہو رہی ہے۔ لیکن بعد میں مجھے احمد سلیم سے پتہ چلا کہ سارا نے چھ ہزار یا اس سے زیادہ رقم کسی کو دی تھی کتاب شائع کرنے کے لئے۔ لیکن نہ کتاب چھپی نہ اس کی رقم واپس ہوئی۔------

۱۲ اپریل ۱۹۸۲ء کی تاریخ میں مجھے سارا کا خط ملا۔---

امرتا!

دشمنوں نے میرے بچوں کے دلوں میں عزت کا بیج بو دیا ہے ایک دن میں نے اپنے بیٹے کی آنکھوں میں نفرت دیکھی تھی۔ مجھے یقین نہ آیا' کیا میرا بیٹا بڑا ہو کر مجھ سے نفرت کرے گا؟ میں یہ برداشت نہ کرپاؤں گی کیا میری سچائیوں کا لگان میرے بچوں کو بھی دینا ہوگا؟

جن کے لئے میری آنکھوں میں آنسو نہیں' ہاتھوں میں کوئی دعا نہیں' کیا وہ مجھ سے اتنے بچھڑ چکے ہیں؟ ہاں امرتا! روایت اور سوسائٹی کا زہر وہ عزت کے پیالے میں پینے لگے ہیں-----

عزت کا بین تو میں بھی بچپن سے سنتی آئی ہوں------

کاش میرے بچے میرے پاس ہوتے اور میں انہیں سچ کے انگاروں میں رہنا سکھلاتی۔

جب کبھی میں بچوں سے ملنے جاتی ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے ان بچوں کے دل ماں کی قبر جیسے ہوگئے ہیں-----

پہلا خوف جو ان کے دل میں ڈالا گیا ' یہ کہ تمہاری ماں غیر مردوں سے مکالمہ کرتی ہے' سگریٹ پیتی ہے۔

دوسرا خوف' جو ان کی عمر سے بڑا ہے-----

ابھی میرے بچوں کا قد میرے گریبان سے چھوٹا ہے----- جیسے جیسے وقت مجھے ترتیب دے گا' زمانے کی اکائیاں بڑھتی ہی جائیں گی-----

امرتا! میں بچوں کے لئے آنکھوں سے زیادہ تڑپتی ہوں اگر بچوں نے بڑے ہو کر "ماں" کے علاوہ کوئی اور لفظ کہا' تو سارا تو اپنی قبر میں بھی نہیں اتر سکے گی---

انسانوں کے داغ دھوتے دھوتے میرے تو ہاتھ کالے پڑ گئے ہیں امرتا! میں ضمیر سے زیادہ جاگ گئی ہوں----

خاموشی میرا دل ہے۔ لیکن میں سمندر سے زیادہ شور مچانا چاہتی ہوں۔

میں ننگے سورج سے زیادہ خوبصورت ہوں' لیکن سیاہ پوش ہوں!

کبھی کبھی ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے تو جانے کیا کیا بکتی رہتی ہوں۔ پچھلے دنوں دو الیکٹرک شاک لگے تو پھر طبیعت کچھ ٹھیک ہوئی---

اس سے تو موت بہتر ہے۔ لیکن خدا اپنے شکار کو اتنی آسانی سے نہیں چھوڑتا۔

میں خدا کی زبان سے ایک ٹوٹا ہوا کھلونا ہوں----

ایک اور بات---

دو دن سے لگا تار لکھ رہی تھی' تو کمرے میں کافی ردی جمع ہوگئی۔ میری بہن نے ردی اکٹھی کی اور باہر پھینکنے لگی۔ اتنے میں امی آگئیں میری بہن سے بولیں۔ کاغذ باہر پھینک کر تونے محلے میں ہماری عزت خراب کرنی ہے؟ ان کاغذوں کا جلادو۔

ہاں امرتا' میرے کمرے میں جتنی ردی نکلتی ہے' امی جلا دیتی ہیں اور کہتی ہیں تم ننگے اور بیہودہ لفظ نہ لکھا کرو۔

اور پھر میں لفظ سے زیادہ خاموش رہنے لگتی ہوں-----

یہ میں کس سنسار میں آگئی امرتا!

بیٹا دیکھے تو نفرت سے ' اور ماں ' میری چتا پر آگ کو بین کرنے کے لئے چھوڑ دیتی ہے----

بھائی کہتے ہیں---- پاگل ہے' ورنہ ہوش میں انسان اتنا نہیں لکھ سکتا---

گھر والوں کو اور اس نام نہاد سوسائٹی کو مجھ سے یہ شکائت ہے کہ میں اپنا گھر نہیں بساتی ----

لیکن میں کہتی ہوں ---- امی جان! روٹیاں تو ہزاروں عورتیں پکا رہی ہیں اور پھر اپنے ہی جہنم میں مر جاتی ہیں' مجھے گندم سے زیادہ انسان کی تلاش ہے ---

میں زیادہ دور کیوں جاؤں ' میری ماں کے شوہر نے دو شادیاں کیں اور میری ماں نے ساٹھ سال رو کر گذار دیے۔ یہ تعلق کی کون سے قسم ہے کہ عورت اور مرد جبر کے عالم میں ستر ستر برس گذار دیں؟

حالانکہ اسلام میں ہے کہ اگر مومن کے دل میں کیڑا ہے تو ہر تعلق حرام ہے۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ جبر کے ماحول میں پرندے بھی اپنے گھونسلوں میں مر جاتے ہیں ----

امرتا! کوئی مندر 'کوئی مسجد' کوئی گرجا ایسا نہیں جہاں اپنے کپڑوں سے نفرت دھو سکوں!

میں کمرے میں اپنی آواز بھول گئی ہوں میرے بدن پر کبھی پرندے نہیں چہچہائے میری سانسوں میں سورج ڈوب رہا ہے میں آنکھوں میں چن دی گئی ہوں ---

امرتا! میں یہاں کسی سے نہیں ملتی۔ احمد سلیم سے کبھی کبھار ملاقات ہوتی ہے۔ بہت لوگ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں' لیکن میں خود ملنا پسند نہیں کرتی' یہ جھوٹ کا باٹ لئے مجھے تولنا چاہتے ہیں۔

میں اکیلی گھومتی رہتی ہوں اور بہت اداس ہوتی ہوں تو سمندر کے کنارے جاکر بیٹھ جاتی ہوں اور پھر سمندر سے باتیں کرتی رہتی ہوں۔

خاندان کی لڑکیاں تک کو مجھ سے دور رہنے کی تاکید کی جاتی ہے۔ کہیں وہ بھی لکھنا شروع نہ کردیں!

دیکھو! امرتا کتنی تنہائی ہے! کبھی کبھی تو آسمان کو دیکھ کر پہروں روتی رہتی ہوں۔---

---

بدن کی قید سے آزاد ہوں' اور روح کس نے دیکھی ہے! وقت تھوڑا رہ گیا ہے امرتا! میں چلی جاؤں گی۔ بدن کے مسکن میں زیادہ دن رہنے سے روح کو زنگ لگ جاتا ہے۔

امرتا! میرے بچے ایک دن تمہارے پاس آئیں گے ان لوگوں سے کہنا۔---

تمہاری ماں خدا سے بھی زیادہ تم سے محبت کرتی تھی' کیونکہ اس نے تو خدا سے زیادہ خاموشی سیکھ لی تھی۔۔۔۔

امرتا! میں جب بھی پودے لگاتی ہوں' مٹی اپنا منہ قبر کی طرح کھول دیتی ہے اور موت تو روز میرے دل میں آن دھڑکتی ہے۔

میں دیواروں سے اکھڑا اکھڑ کر رہی ہوں۔۔۔۔۔

امرتا! میں تم سے دکھ سہنا سیکھ گئی ہوں! ورنہ میں تو ہاتھوں سے گری ہوئی دعا تھی۔

امروز کو سلام' بچوں کو پیار

تمہاری۔ سارا شگفتہ

گنبد کی آواز

سارا پنجابی میں بھی نظم کہتی تھی اور اردو میں بھی۔ زیادہ اردو میں۔ پاکستان میں اس کی نظموں کا مجموعہ شائع نہیں ہو رہا تھا۔ اس لئے حالات کا تقاضہ تھا کہ اس کی نظموں کا ایک مجموعہ میں جلدی سے جلدی شائع کردوں۔

کتاب کو جلدی شائع کرنے کا میرے پاس ایک ہی ذریعہ تھا کہ میں اسے اپنے پرکاشن سے شائع کروں۔ اور اپنے پرکاشن سے شائع کرنے کے لئے پوری کتاب کا پنجابی میں ہونا لازی تھا۔ اس لئے میں امروز کی مدد سے سارا کی نظموں کا' خطوں کا اور اس کی داستان کا ترجمہ کرنے لگی۔۔۔۔۔

کتاب کو ذہنی طور پر میں نے چار حصوں میں تقسیم کیا' کہ پہلے حصے میں اس سے کی گئی میری بات چیت شامل ہوگی' جو پاٹھکوں سے سارا کا تعارف کرا سکے گی۔ دوسرے حصے میں اس کی نظمیں' تیسرے حصے میں اس کے خط اور چوتھے حصے میں' اس کے قلم سے لکھی ہوئی اس کی داستان!

یہ سب میں نے سارا کو لکھا' اور تاکید کی کہ اپنی داستان میں جو کچھ بھی اور لکھنا چاہتی ہے' لکھ کر بھیج دے۔ میں بہت جلدی اس کی کتاب شائع کردوں گی۔

جواب میں ۵ ستمبر ۱۹۸۲ء کی تاریخ میں سارا کا خط آیا۔۔۔۔

امرتا!

تم نے جس محبت سے میری حوصلہ افزائی کی ہے میں اسی محبت سے اپنے سارے دریا تمہاری مٹھی میں قید کرتی ہوں!

امرتا! میری امرتا! یہ سب تو تمہاری محبت ہے' ورنہ میں تو ہاتھوں سے گری ہوئی دعا ہوں۔۔۔۔

ہاں امرتا! اب آواز کو صرف گنبد میں قید نہیں رہنا چاہئے۔

میرے گھر آئی ہو تو دیکھو میرا گھر بھی - کبھی کبھی تو ذہنی توازن ہی بگڑ جاتا ہے۔ امی بتاتی ہیں کہ میں رات کو کپڑے اتار دیتی ہوں اور جانے کیا کیا بولتی رہتی ہوں۔ ہر دوسرے تیسرے روز یہ دورہ پڑ جاتا ہے۔ میرے لئے یہ صورت حال بہت افسوس ناک ہے۔ میں پاگل نہیں ہونا چاہتی۔ ابھی تو میں نے بہت سے کام کرنے ہیں۔

ربڑ کی بے جان گڑیا کے سینے میں ایک سیٹی دھڑکتی ہے' "سنگ مرمر کے پھولوں میں مردہ آنکھیں' زندہ ہاتھ"

زمین کاشت کرتی ہوں تو پھر کہہ دیتی ہوں - - - لو' یہ زمین بھی تمہاری' یہ موسم بھی تمہارے!

یہ میں کیسے پودے لگاتی ہوں امرتا! کہ مٹی اپنا منہ قبر جتنا کھول دیتی ہے۔

امرتا! حالات کچھ ٹھیک نہیں ہیں' بائیس دن لاہور قلعہ میں قید رہی' سزائیں بڑی سخت ہیں' ایک تو بیماری نے مجھے بزدل بنا رکھا ہے۔ انسانی صحیفہ کے بارے میں ابھی ذرا محتاط ہوں۔ اور پاکستان میں وہ کتاب چھپ بھی نہیں سکتی۔

مجھے پتہ ہے - - - - - یہ کتاب چھپنے کے بعد میری سزا پھانسی سے کم نہیں ہوگی لیکن مجھے کوئی پرواہ نہیں جانے ایک ایک دن میں کتنی بار سولی پر چڑھتی ہوں۔ یزداں کی آہ سے کتاب جل جائے تو کفارہ کون کرے۔

کاش مجھے ایک سال صحت یابی کا مل جائے تو میں اپنے کام ختم کر ڈالوں۔ یہاں سختی بہت ہے۔ میرے بہت سے خطوط سنسر ہو جاتے ہیں۔

میں نے اپنی آپ بیتی کی تین قسطیں ارسال کی تھیں اگر نہیں ملیں تو دوبارہ لکھ کر پوسٹ کردوں ؟

صحت ٹھیک رہی تو ضرور ہندوستان آؤں گی پھر میں اپنی امرتا سے ڈھیروں باتیں کروں گی۔

امرتا! تیری وجہ سے تو سارا زندہ ہے' ورنہ میں تو ہاتھوں سے گری ہوئی دعا ہوں۔

تمہاری اپنی - سارا شگفتہ

۵ - ۹ - ۸۲ بروز منگل

سارا کا یہ خط پڑھ کر

میری پریشانی لاہور قلعہ کی دیواروں سے ٹکرانے لگی
دیواریں خاموش تھیں
فاصلے گرد سے بھرے ہوئے تھے
اور سنتری کی مٹھی بند تھی----

ایک چیخ کا اتہاس

دیواروں، فاصلوں اور مٹھیوں سے اپنے بدن کو چراتی ہوئی سارا کی ایک نظم میرے پاس پہونچی۔

امرتا! آخر کس سے باتیں کروں!
انسان وہ ہے، جو بدی کو بھی ایمانداری سے خرچ کرے!
ایک بات پر سوچنا پڑے گا۔۔۔۔
نہیں تو لوہا ہمیں چبا جائے گا۔
سلاخ تراشو!
کہ قید کا نیا مفہوم سامنے آئے گا
لفظ بڑا آدم خور ہوتا ہے
یہ ردی پسند نہیں کرتا
یہ تقسیم ہوتے ہیں
تو لفظ جنم لیتا ہے۔۔۔۔
اور اس کی بھی عمر ہوتی ہے۔۔۔
آج ٹوٹے مکان سے گذری۔۔۔۔۔
تو میری سوندھی سوندھی خوشبو ڈھل چکی تھی
بتانے والوں نے بتایا۔۔۔۔
انسان جھونپڑی میں تمہارے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے
اور توبہ کرنے والے تھوک رہے تھے۔۔۔۔
یہ ساری دکانیں قسطوں پر تھیں

اور میں، بتانے والے کی تمام قسطیں پوری نہ کر سکی تھی
بتانے والے نے بتایا----
کہ تم اتنی میٹھی تھیں
کہ تمہارے نمک پر مکھیاں بھنبھا رہی تھیں
تم اتنی نیک ہو-----
کہ خدا کی طرح لوگ تم سے انکار کر رہے ہیں
اور تم سے ایک قید خانہ شروع ہوتا ہے----
اور میری آواز اتنی پونچھ دی گئی
کہ میرے لب ہلتے تو لوگ ہنستے----
مگر میری کٹھ پتلی مجھ سے بہت خوش تھی
روز تماشا کرتی----
بتانے والے نے بتایا----
کہ میں بزرگوں کے پلو سے پیسے چرا تی رہی ہوں
میں نے یہ پیسے کبھی خرچ نہیں کئے
خیرات کر دی-----
میں نے مول کے پیسے سے صراحیاں بھری تھیں
اس لئے پیاس مجھے مہنگی پڑی----
بتانے والوں نے بتایا-----
تیری کوکھ سے پیدا ہونے والے
تیرے صبر سے مر گئے
اور تیری کچی ہڈی ملک بدر کر دی گئی---
تیرے صلوں سے ذائقے کڑوے ہو گئے
تم---- تنہائی میں اچار چاٹتی
اور دوہری ہوتے ہی بانجھ کر دی جاتیں----
بتانے والوں نے بتایا----
کہ خدا خسارے میں ہے

جب سے سمندر سے قریب رہنے لگا ہے
محلے کے بچے دور تک نہیں کھیلتے
ان کی مائیں انہیں بتاتی تھیں
کہ کھیل سے زیادہ گیند مہنگی ہوتی ہے
جب میں قبیلے میں شعر سناتی ہوں
تو لوگ کہتے ہیں---- بہت وسیع لفظ ہے
انہیں کون بتلائے----
وسیع ہونے کے لئے کتنا چھوٹا ہونا پڑتا ہے---

بتانے والوں نے بتایا -----
تمہاری ماں کھانس رہی ہے
اور دوا کی خالی شیشی تک چار آنے میں آتی ہے
اس کا دکھ یا تو نہیں ہوں
یا کسی بھی علاقے کی کوئی ایک قبر----
بتانے والوں نے بتایا-----
کہ ناگ منی کے تہوار پر بہت سے سانپ چھوڑ گئے
لیکن میں اتنی زہریلی ہو چکی ہوں
کہ اپنے من کے گرد نہیں ناچ سکتی

مور اپنے پاؤں دیکھ کر روتا ہے
میں اپنے انسان دیکھ کر روتی ہوں

ان کھیتوں کی اجرت ہی ہماری بھوک ہے
جوتی کے ٹوٹنے پر ایک کیل ٹھونک دی جاتی ہے
اور سفر ایجاد کر دیا جاتا ہے

بتانے والوں نے بتایا-----
میرے محلے کے بہت سے بچے ہیں

بعض کو ڈگری چپا جائے گی
کسی کو سوچ کے فن پارے ادا کرنے ہوں گے
کوئی ٹکسال پر بہہ جائے گا
سورج نکلنے سے پہلے
اس محلے کا نام تبدیل کردیا جائے گا
اور اس محلے کے سنگ میل پر----
بچوں کی عمر لکھ دی جائے گی----

میں بھی پہلے پیڑوں کی طرح سوچا کرتی تھی
آنے والے کو مبارک باد دیتی تھی
اور جانے والے کو الوداع کہتی تھی
ہمارے محلے میں بات کی قیمت زیادہ ہے
اور اناج کی کم
اس لئے ہمارے ترازو کے پٹ
موسم سے کھیلتے ہیں----

میرے قبیلے کی کوکھ سے
جب صرف چیخ پیدا ہوئی
تو میں نے گود سے بچہ پھینک دیا
اور چیخ کو گود میں لے لیا----

میں جانتی ہوں تھی کی آدی واسیوں کی وہ کہانی---- گرتے بادلوں میں بچوں کی روحوں کے بلکنے کی' اور زمین پر کسی ماں کی کوکھ ڈھونڈنے کی---- یہاں تک پھیل جائے گی کہ کسی قبیلے میں پیدا ہوئی چیخ' سارا کو اپنی گود میں لینا ہوگی---- سارا کی اس نظم نے مجھے رلا رلا دیا۔

ضمیر کا زہر

۱۱ اکتوبر ۱۹۸۲ء کی تاریخ میں لکھا ہو سارا کا خط آیا۔

امرتا!

الیکٹرک شاک لگنے کی وجہ سے ابھی تک طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی میں تو ایک مذاق ہوں امرتا! اکیس روز پاگل خانے میں رہ کر آئی ہوں کبھی پاگل خانے میں کبھی گھر۔۔۔۔

تم نے جس محبت سے مجھے خط لکھے ہیں' اس کے لئے محبت لفظ چھوٹا ہے۔ میرے ہاتھ بہت کانپتے ہیں۔ جسمانی تکلیف بھی بڑھ گئی ہے۔ کانپتے ہاتھوں سے تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔

ایک ماں ہے جو میری وحشت میں شریک رہتی ہے۔ باقی تو سارے لوگ نہ زمین بن سکے' نہ آنسو۔

تمام رات ہاتھوں میں بیت جاتی ہے۔ دار پر سوتی ہوں جیل کی قید بامشقت کاٹتی ہوں۔ بہت سناٹا ہے یادداشت بھی بہت خراب ہوگئی ہے چند روز پہلے تو کسی کو بھی نہیں پہچانتی تھی۔ ابھی اکیلے کہیں نہیں جاسکتی۔ راستہ بھول جاتی ہوں۔

بیماری کی وجہ سے کتاب بھی چھپ نہیں پائی' بس صرف پریس جانا باقی ہے۔ باقی تمام کام تو ہو چکا۔ جیسے ہی طبیعت ذرا ٹھیک ہوئی اپنی امرتا کے پاس ضرور ہندوستان آؤں گی۔

چھاؤں کا در تو پیڑوں کے پاس ہی ہوتا ہے۔

آگ کا رنگ میرے پیروں پر رہنے لگا ہے امرتا! میں پاگل ہونا نہیں چاہتی امرتا! ایک ذہن تھا' وہ بھی ساتھ چھوڑ رہا ہے۔

میں چتا میں' رنگ دی گئی ہوں۔۔۔۔

بکی ہوئی زمینوں پر پیڑ لگانے سے چھاؤں کڑوی ہوجائے گی۔

ٹوٹے ہوئے چاند کی زبان آسمان میں رہ گئی۔ اب خموشی کا کیا ہوگا!

میں خدا کی آواز کی طرح اپنی آواز سے دور رہنا چاہتی ہوں۔

میں نے کبھی زبان نہیں ہاری اور نہ کبھی ہاتھ پھیلے ہیں۔

سورج رنگوں سے بے وفائیاں نبھاتا رہتا ہے۔

میں خدا سے زیادہ تنہا ہوں' لیکن اپنے گناہوں میں شریک ہوں۔

ضمیر کا زہر تو سقراط کے پیالے سے بھی بڑا ہے۔

امرتا! دعا فقیر سے زیادہ بھوکی ہوتی ہے۔

میں کتنی مٹی چل آئی ہوں اندیشوں کی جوتیاں ٹوٹتی رہیں اور دل میں دعا

طبیعت خراب رہنے لگی ہے امرتا! کاش' تم پاس ہوتیں یہاں ہے؟

کبھی کبھی تو رات بھر چیخیں مارنے کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ جب ہوش آتا ہے تو بہت شرمندہ ہوتی ہوں۔ گھر والے بے چارے خوانخواہ پریشان ہوجاتے ہیں تمام رات ٹہلتی رہتی ہوں پیروں پر ورم آجاتا ہے کبھی کبھی زبان میں لکنت آجاتی ہے۔

دعا کرو امرتا! میں مٹی سے زیادہ خاموش ہوجاؤں۔

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اگر میری شادی کردی جائے تو میں ٹھیک ہوجاؤں گی۔ رشتے تو بہت آتے ہیں امرتا! دوست نہیں ملتا۔ کیا کروں؟ بات کا زیادہ جان جانا ہی تو دکھ ہے۔ میں جھوٹ' مکاری' فریب سب سے تو آشنا ہوں رشتہ کس سے باندھوں!

امروز کو بہت' بہت' بہت سلام' میں امروز کی دل میں بہت قدر کرتی ہوں!

خود نوشت لکھ رہی۔ ہوں جلد ارسال کروں گی۔ تمہارے خط آنے پر نئی زندگی ملتی ہے۔

سارا شگفتہ

جلتی بجھتی عورت

اور کچھ دنوں بعد سارا نے اپنی داستان کا آخری حصہ لکھ کر بھیج دیا' جس پر ۲۵ نومبر ۱۹۸۴ء کی تاریخ تھی -----

"میری زندگی میں کئی مرد آئے' لیکن میں صرف ایک آدھ مرد کی حیرت میں شریک رہی۔

عمر کیونکہ بڑی ہے' اس لئے کھلونے جلد ہی ٹوٹ جاتے ہیں۔

اکثر تنہا ہی سمندر پر جاتی ہوں تو سمندر کے ایک بھی سوال کا جواب نہیں دے پاتی۔

ذات میں عیاری اور مکاری نہیں ہے۔ جب بھی کوئی ملتا ہے' میری سچائیاں سن کر قدم چرا لیتا ہے۔

میرا بھی جی چاہتا ہے کہ کوئی امروز جتنا بڑا آدمی مجھے ملے اور میں تنہائی کے عذاب سے بچوں۔

لکھنے کی وجہ سے گھر والے شدید نفرت کرتے ہیں اور کہتے ہیں تم خاندان کی مٹی پلید کر رہی ہو۔ اچھا ہے اگر موت تمہیں اپنی گود میں لے لے۔ آئے دن رسالوں میں ' اخباروں میں ہماری سیاہیاں دہراتی رہتی ہو۔

گھر میں کوئی مہمان آجائے تو اسی جلدی سے زردی چھننے لگتی ہیں اور پھر میرے لفظ آگ کی نذر ہوجاتے ہیں۔

ترازو کے ایک پلڑے میں ہمیشہ پتھر ہوتا ہے اور شاید اسی کا نام انصاف یا سچائی ہے۔

پتھر ہی تو انصاف کرتے ہیں۔

نفرت کی دیگچیوں سے بھری ہوئی آنکھیں جب مجھے دیکھتی ہیں ' تو میں اپنا دل پڑھنے لگتی ہوں!

سچائیوں سے لوگ مرنے لگے' تو مرے ہوئے لوگوں کے جھوٹ جمع رکھو کہ ہمیں ننگی آنکھوں کو بھی دفنانا ہوتا ہے۔۔۔۔۔

میں نے زندگی میں چار خودکشی کی ہیں' لیکن موت نہیں آئی خدا دن گن رہا ہو تو زہر امرت بن جاتا ہے۔

ابھی چھ ماہ پہلے میں نے اپنی چوتھی کتاب "آنکھیں" مکمل کرلی تو پھر ذائقہ بدلنے کی سوجھی۔ بازار سے زہر خرید کر لائی اور پھر اپنی بڑی ہی پیاری دوست امرتا پریتم کو خط لکھا' بڑی تفصیل سے۔

اس رات امی نے مجھے چائے لا کر دی اور میں نے چائے کے ساتھ زہر بھی پی لیا۔ اور ایک چھوٹا سا خط لکھا کہ میں خودکشی کر رہی ہوں اس دنیا کو تھوک دینا چاہتی ہوں۔

میں نے وہ خط امی کو دیا' امی چونک پڑیں۔ وہ پڑھی لکھی نہیں ہیں۔ انہوں نے خط رکھ لیا اور میں نے کہا۔۔۔۔ یہ خط صبح بڑے بھائی کو دے دیجئے گا۔

سورج کی آواز عورت نے سنی تو چار دیواری کی کوکھ سے باہر نکلی اور دیکھا۔۔۔ مٹی پر ستارے رو رہے تھے اور زمین گرد ہو رہی ہے۔۔۔۔

اس نے انکار کو کوئی چہروں سے دیکھا۔ عورت نے اپنی آنکھوں سے پوچھا۔ میرا نام کیا ہے۔۔۔

آنکھیں' جن پر وقت کا گرہن لگ چکا تھا' بولیں ۔۔۔ آدم!

دریا جو صدیوں سے اپنا راستہ بدل رہا تھا اور اس کا ماضی صرف ایک زمین رہ گیا تھا اس نے سنا' تو بولا۔۔۔۔۔۔ اے عورت! میرا سفر گواہی دیتا ہے کہ تیرا نام آدم نہیں' حوا ہے۔

حوا نے جلدی جلدی اپنے قدم لپیٹے اور کہا۔ راہی! تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ زمین رکنے سے پہلے میرا نام چار دیواری نہیں' حوا تھا۔ میں صدیوں سے مر رہی ہوں اور سیاہ ہوں۔

صدیوں سے ہی وقت کی گھڑیوں میں قید کردیا گیا ہے۔

عورت سوچنے لگی۔ عورت کی ریاست چادر کشائی سے بڑی نہیں ہوتی۔۔۔۔

اور لاٹھیوں کے موسم سہنا اس کا دستور ہوتا ہے۔۔۔۔

آدم کے ریوڑ میں ہر کھونٹے پر حوا سے زیادہ رسی دراز ہوتی ہے۔

حوا نے سوچنا چھوڑا تو پتھروں سے کہنے لگی۔ روٹی مسور کی دال کے ساتھ اچھی لگتی

ہے، تم تو اچار کے ساتھ بھی اچھے نہ لگے۔۔۔۔۔

یہ کھلا آسمان ہماری چھت ہے تم کون ہوتے ہو، ہمیں چار اینٹوں میں دفن کرنے والے۔۔۔۔۔

آج تو میں اتنا سچ تولوں گی کہ رسی اپنی تاریخ بھول جائے گی۔

اور کھولو میری انگیا کے بند، مگر تمہاری بھوک صرف ایک نوالہ ہی نکلے گی۔

کیوں چکھتے ہو اپنی ماؤں کو!

کیوں کرتے ہو بہنوں کی چادر کشائی؟

کھاؤ! کھاؤ پہلے اپنے نطفے کی قسم

لیکن تم اپنا نطفہ نہیں جانتے۔

تم کیا جانو کہ چوڑی کیسے بجتی ہے۔

اور آنکھ کیسے بجتی ہے۔

ماؤں کی منڈی میں جسموں کی سوداگری کرتے ہو؟

تم اپنے بدن سے عورت کو نہیں ناپ سکتے؟

کہ عورت اپنی سرنگ سے انسان جنتی ہے

اپنی حیا سے نہیں۔

تم وہ آدم نہیں جسے حوا ڈھونڈتی ہے

وہ آدم، وہ حوا تو جذبوں کے مالک تھے!

گھر میں اگر دکھ کی بھٹی دہکتی تھی، تو دونوں کی آنکھیں انگار ہوجاتی تھیں، اور دل کے انگاروں پر ہی وہ دونوں جلتے بجھتے تھے۔۔۔۔۔

بانسری کی لے ان کے قدم گنتی تھی

اور مٹی کی دعا تھے وہ دونوں!

اور میں ۔۔۔۔۔ میں تو ہاتھوں سے گری ہوئی دعا ہوں۔۔۔۔

سارا شگفتہ

سو یہ تھی ایک جلتی بجھتی عورت ۔۔۔۔۔سارا شگفتہ

جس نے سقراط کے پیالے سے بھی بڑا ضمیر کا زہر پی لیا۔۔۔۔

دنیا کے اتہاس میں بہت سی کتابیں ہیں جو لوگوں نے جیلوں میں لکھیں۔ صرف مفکر

لوگوں نے نہیں فرانس کے ژاں ژینے جیسی نامی گناہ گار نے بھی۔ لیکن سارا ایک ہی ایسی عورت ہے' جس نے پاگل قرار دیئے جانے کے بعد پاگل خانے میں عورتوں کی گفتگو لکھی۔

-----اور جس نے معزز لوگوں کی دنیا میں زیر ناف جینے سے انکار کردیا----

میں نہیں جانتی سارا کی کتنی نظمیں اور کتنے خط مجھ تک پہونچتے پہونچتے سنسر کی نذر ہو گئے اور کتنے اس "ردی" میں جل گئے جو "ردی" اس کے گھر میں جلائی جاتی تھی----

لیکن جو کچھ بھی مجھ تک پہونچا میں اسے ایک ترتیب دے کر جلدی سے.جلدی ایک کتاب کی صورت میں سارا کی نذر کرنا چاہتی تھی----

۱۹۸۴ء میں سارا کا جو آخری خط آیا اس پر ۱۱ اکتوبر کی تاریخ تھی اور اس کی داستان کا جو آخری حصہ ملا اس پر ۲۵ نومبر کی تاریخ تھی۔

کتاب پریس میں تھی اور آخری حصہ میں ترجمہ کر رہی تھی جب خبر ملی ---- سارا بہت بیمار ہے' اسپتال میں ہے-----

میں کبھی کتاب کے پہلے حصے کے پروف دیکھتی' کبھی آخری حصے کا ترجمہ کرتی خوف زدہ تھی جانتی تھی کہ اگرچہ سارا نے اپنی چار کتابوں کا سلسلہ ذہن میں بنا رکھا ہے لیکن وہاں اس کی ایک کتاب بھی شائع نہیں ہوپائے گی اور میں چاہتی تھی کہ کم از کم ایک کتاب اسے ضرور دے سکوں!

چوڑیوں کا قہقہہ

احمد سلیم نے یہ خبر بھی دی کہ سارا کے ساتھ ایک اور حادثہ پیش آیا ہے۔----
بہت پریشانی ہوئی کہ کیا زندگی کا لگان ابھی اور سارا پر باقی ہے ؟
سارا نے مجھے خط لکھا تھا ' بہت تفصیل سے لیکن یا تو ڈاک میں ڈالنا بھول گئی تھی یا وہ کہیں بہت دن سنسر کی میز پر پڑا رہا ہوگا۔ خط ملا تو دیکھا خط میں ہی ایک جگہ ۸ جنوری کی تاریخ تھی اور آخر میں کوئی تاریخ نہیں تھی۔ اور خط کے پہلے حصے کی تفصیل شاید گئے سال کے نومبر کے مہینے کی رہی ہوگی لیکن یہ خط مجھے کئی مہینوں بعد ملا۔ لکھا تھا۔---
شادی------ شاید یہ ماں کی آخری خواہش تھی جو میں نے مانی ----
امرتا!
مبارک باد قبول کی۔ ہماری زمین کے دستور کے مطابق ہمیں حرام سے حلال ہونا ہی پڑتا ہے۔
مجھے پاگل خانے سے آئے ہوئے دو یا تین روز ہی ہوئے تھے کہ امی نے کہا کہ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اگر تمہاری شادی کر دی جائے تو تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔ بیٹی' یہ تمہارا علاج ہے۔
شادی ؟------ میری تو آواز کالی پڑ گئی۔ نہیں امی ! میرے بدن سے تمہاری کوکھ کا سایہ نہیں جاتا۔
ان دنوں پانچ چھ نقطوں کی آنکھیں میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہننا چاہتی تھیں۔ ایک روز امی کی طبیعت بہت خراب تھی میں ان کے قدم داب رہی تھی۔ اچانک میں نے امی سے کہا۔--- اب تو آپ روز روز بیمار رہنے لگی ہیں----
وہ بولیں --- تمہیں دیکھ دیکھ کر۔ میرا کہنا مان لو!

چوڑیوں کے قہقہے میں شامل ہوجا! جوان ہے۔ محلے والے بھی باتیں بناتے ہیں۔ تیری اکیلی لڑکی سڑکوں پر گھومتی رہتی ہے۔ جانے کہاں جاتی ہے' اور جانے کہاں سے آتی ہے' میں بہت دکھ جاتی ہوں بیٹی!

میں بہت کچھ سوچنے لگی۔ پھر ایک روز میں اور امی دھوپ تاپ رہے تھے کہ میں نے محسوس کیا ---- امی چپکے چپکے آہیں بھرتی ہیں اور چوری چوری مجھے دیکھتی ہیں۔

میں نے امی سے کہا۔ اگر امی میں تمہارا کہنا مان لوں تو؟

میری ساری بیماری جاتی رہے گی ---- میں بالکل ٹھیک ہوجاؤں گی۔

لیکن امی آپ اکیلی رہ جائیں گی۔

کتنے سال ہوگئے تیرا انکار سنتے تیرے بہانے تو مجھے مرنے بھی نہیں دیتے۔ مجھے ذلت سے بچا لے بیٹی! ہاں کہہ دے۔ مانا کہ لڑکا بہت بدصورت ہے۔ پڑھا لکھا بھی نہیں۔ لیکن اتنے اتنے پڑھے لکھوں نے تجھے دکھوں کے سوا کیا دیا ہے۔ یہ ٹھیک رہے گا۔

جیسی تمہاری مرضی امی! لیکن جانتی ہے چوڑیاں کبھی قہقہہ لگانے سے باز نہیں آتیں؟

• ہار سے ڈرتی ہے؟

۱۔ "کس مصیبت سے شادی ہوگئی -----"

۲۔ "ہمارے یہاں عورت سگریٹ پیئے تو اسے گولی مار دی جاتی ہے۔"

۳۔ "پڑھنے لکھنے پر پابندی۔"

۴۔ "کیا لکھ رہی ہے؟ ادھر آؤ! میرے پیر دباؤ! بڑی آئی شاعرہ"

۵۔ "زیور ہر وقت پہنا کرو۔ اسی سے عزت ہوتی ہے۔"

۶۔ "مشہور شاعرہ کا سانس اب میری مٹھی کے برابر ہے"

پندرہ روز تک میں خاموش رہی۔

سونا دھات ہے اور زمین سونے یعنی کہ دھات سے زیادہ زندہ ہوں۔ میں ہنستی ہوں۔ ایک جبر سے دوسرے جبر تک۔

"مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ تم ایک کمپنی ہو' اپنا لہجہ درست کرو ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

"تم دو کوڑی کی شاعرہ تمہارا علم تو تمہیں آدھی روٹی بھی نہیں دیتا لکھنے پڑھنے سے کیا

فائدہ ---- "

مجھے اپنی مفلس نگاہوں پر بہت افسوس ہوا۔
حالت زار اے قفس! تیری تو نہ تھی' میری تھی ----
میں کس زمین کی آبرو ہوں میں نہیں جانتی ----
پچیس روز بعد میں نے کھمبی سے کہا۔ مجھے طلاق چاہیے۔
نہیں دوں گا! تمہیں یہاں کون سی تکلیف ہے۔ کنیا سے تجھے گھر تک لایا ہوں۔ بیس ہزار روپے حق مہر ہے تیرا۔
وہ میں نے تجھے معاف کیا۔
خیر' بڑی مشکل سے طلاق حاصل کی اور چین سے سوئی۔
جب میں پھر امی کے گھر آئی تو امی نے بڑی ہمت سے مجھے اپنے گلے سے لگایا اور بولیں ---- "کوئی بات نہیں میں سمجھوں گی' میں نے تیری شادی ہی نہیں کی - یہ تیرا گھر ہے زیادہ سوچا نہ کر کہ تیرے ذہن پر اثر ہو جاتا ہے۔"
ڈور تھامی تو ہاتھ میں ایک اور زخمی لکیر بن گئی۔
یہ سارا کی چوڑیوں کا قہقہہ تھا
میں جانتی تھی کہ اس قہقہہ میں چوڑیوں کے زخمی ہونٹ زخمی ہوئے یا نہیں' پر یہ جانتی ہوں کہ چوڑیوں کی اس ہنسی سے میرے کان زخمی ہو گئے ------

کی قبر کچی ہے۔ جس وقت اس کو قبر میں اتارا گیا تو قبر سے خوشبو آ رہی تھی۔
میں جھوٹ سے پہلے یقیناً" بچ رہی ہوں گی ----
لیکن میں نہیں جانتی جھوٹ کا روگ میری چھاتیوں سے کب سے بہہ رہا ہے۔ کاش' میں دنیا سے چھپ کر اپنے آپ کو دیکھ سکتی۔
میں کچھ نہیں دیکھ سکتی' میری آنکھیں مر گئی ہیں' جب ہی تو میری ماں مر گئی ہے --

کہاں ہے ماں؟ نہ میری آنکھوں میں' نہ میری کوکھ میں' نہ تیری کوکھ میں امرتا!
مجھے تو سادہ ورقے سے زیادہ چپ رہنے کا حق تھا۔

میں نے جس دن اپنا حق مانگا تھا میری ماں تو اسی دن مر گئی تھی۔ ۔ ۔ ۔

آج تو میرے پستانوں سے زہر بہہ رہا ہے اگر میرے بچے میرے پاس آئے تو مر جائیں گے۔ انہیں دور رکھو کہ یہ اخبار کی سرخیاں بننے والی شاعرہ کے بچے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مجھے وقت کے جہنم میں پھانسی دی گئی۔ اور پھر خود داریوں کی رسیوں سے کس دیا گیا۔

میں نے ماں کے دھڑکتے دل پر کبھی ہاتھ نہیں رکھا کہ میرے ہاتھ لفظ سے زیادہ نہیں رینگ سکتے تھے۔

ماں مری ہے تو احساس ہوا ہے۔ ۔ ۔ ۔ میرے بچے بھی ماں کی خود داریوں سے مر گئے ہوں گے۔ کوئی زندہ نہیں۔ کیا میرے بچے بھی؟ کہاں ہوں گے؟ میرے پاس تو نہیں!

میں کون سی زندہ رہ گئی ہوں!

آنکھوں کی سڑاند ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے کچھ نظر نہیں آتا جن کی مائیں زندہ رہ گئی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ میرے لئے دعا مانگیں!

آج تو نہ میں ماں والی ہوں' اور نہ بیٹی والی۔

شوک سے کمرہ بھرا پڑا ہے دور دور سے لوگ آن پہونچے ہیں۔ میری چھ بہنیں اور چار بھائی بھی۔ ان کی چیخیں تو مجھے بازار میں لے آئی ہیں۔ ۔ ۔ شگفتہ! تمہاری وجہ سے ہماری ماں مر گئی ہے۔ اسے تمہارے دکھ لے ڈوبے۔ اسے صرف تمہارا دکھ تھا۔

خاندان کی لڑکیوں کو مرے پاس بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے کہ میں لکھ رہی ہوں تو آواز آتی ہے۔۔۔ دیکھنا! ہماری عزت کا خیال کرنا' کمبخت اخباروں ' رسالوں کے لئے ہماری سرخیاں لکھ رہی ہو؟

نفرتوں کے جہنم دن میں اور موت کے جہنم دن ایک اور آواز شامل ہوئی' جو کبھی روح میں نہ سنی گئی۔ سیکڑوں چہروں کی نفرت سے رنگی ہوئی ہنسی ہنس رہی ہوں۔

میری سیاہ پوروں میں کوئی چاند نہیں ٹوٹا۔ ۔ ۔ لیکن میری قبر مٹی کو نفرت سے حاملہ کر دے گی۔

نفرت کی گواہی سب سے زیادہ سچی ہوتی ہے۔ کیا آج میں زندہ ہوں؟

ساحل ہمیشہ سمندر کے فریب میں جلا رہتا ہے آنکھیں جل سے زیادہ سیاہ ہوتی ہیں۔

چھاؤں سورج کے ساتھ ساتھ بیت جاتی ہے۔

آج میں ایک ریوڑ ہوں عزت کے ایک ریوڑ میں کمال کی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ ۔ ۔

حلال بدن پر آنکھیں حرام ہوتی ہیں۔
اگر میں دکھ سے زیادہ شرمندہ ہوئی تو قبر سے زیادہ مر نہیں سکتی۔
تمہاری آنکھیں مجھے اتنا کیوں ٹٹولتی ہیں!
میری ماں ---- موت ---- میرے صبر ---- میرے جھوٹ ----
میں ایک ڈولی میں مرتی ہوں تو دوسری ڈولی تیار ہو جاتی ہے ---
دوغلے موسم میں کون سے پھول کھلاؤں؟
میری زبان دکھ سے زیادہ گہری ہے
میں کہاں بولتی ہوں امرتا!
میں پاگل ہو جاتی! تو امی مجھے لئے لئے پھرتیں۔
اب کون ہے؟

تمام رات میں تڑپتی رہتی تو وہ بھی تمام رات جاگا کرتیں۔ میں نے اپنی امی کو بہت دکھ دیئے ہیں امرتا!

ہاں --- ہاں --- شام سے پہلے سورج روز اپنی موت کا انتظار کرتا ہے۔ رات میری آنکھیں بھی چھپا دیتی ہے۔

خدا انسان سے صرف موت جتنا سچ بول سکتا ہے --- میں ماں کو دکھوں کی چتا میں اور میری بیٹی میری چتا میں جل رہی ہے امرتا!

یہ کیسا چراغاں ہے؟ مجھے بتلاؤ امرتا!
میری امی کیوں مر گئی ہے؟

سورج کے ڈوبنے سے زمین کی چھاؤں بکھر جاتی ہے۔ جا سوئی خاک کی گود میں مجھے جاگتی راتوں میں ڈر لگتا ہے۔ دل کی جگہ سناٹا دھڑک رہا ہے۔

امرتا! جب میں نے اپنی امی کے گھر کو اپنی امی کے لہو سے رنگ دیا' تو موسموں کے رنگ لکھنے لگی ---

اور بڑے سچے لفظ لکھنے والی مشہور ہو گئی ---

امی! میری امی! میری دکھی امی! اب مجھے کبھی نہیں کہیں گی۔
رات بھر نہ لکھا کر! سوجا! سوجا میری شگفتہ سوجا! نہیں تو وہ دورہ پڑ جائے گا ---
میرا ایک کاغذ بھی ادھر ادھر ہو جاتا' تو گھر میں قیامت برپا کر دیتی۔

اس لئے میری امی ایک کاغذ سنبھال کر رکھا کرتی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد چائے کا پیالہ میری میز پر ہوتا۔

میں نے کبھی اٹھ کر پانی نہیں پیا۔ اب کون ہے امرتا!

میری سیاہ باتیں تو میری امی کی کالی آنکھوں میں دفن ہو گئی۔

میرے دکھ' میرے روگ' میری ماں کے دل پر سسکتے رہے۔ میری لاپرواہیوں سے میری ماں کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔۔۔ وہ میرے لباس کے چندی سیا کرتی تھیں۔

امرتا! سن کبھی مجھے اپنے پیروں کے زخم نہیں دکھلائے۔۔۔

میری ماں بہت عظیم عورت تھی۔۔۔

میری ڈولیاں رخصت کرتے کرتے وہ خود ڈولی میں بیٹھ کر چلی گئی۔

وہ قبرستان سے بیاہ دی گئی ہے۔۔۔

مٹی میری ماں سے حاملہ ہو گئی ہے۔ اب قبرستانوں کی نسل بدل جائے گی۔

امرتا! میری امی مر گئیں ہیں۔ میں اکیلی رہ گئی ہوں۔

امرتا! کاش' اس وقت تو میرے پاس ہوتی۔ میرے ارد گرد اس وقت سب انجانے بے گانے لوگ ہیں۔

امرتا! میری امی مر گئی۔۔ کیا یہ سچ ہے؟ مجھے یقین نہیں آتا امرتا!

امی سورج سے زیادہ سچ بولا کرتی تھی۔۔۔

امی۔۔۔ میری امی۔۔۔ میری امی جی۔۔۔

میں پھولوں سے زیادہ ہنس سکتی تھی۔

اور موت سے زیادہ مر سکتی تھی۔

تم کیوں مر گئیں۔

کیا پرندے اپنی پرواز سے بچھڑ چکے؟

گناہوں کی گواہی میری حیرت کو ڈستی ہے۔۔۔

آج میں کوڑھی ہو گئی ہوں مجھ سے نفرت کرو!

میں نے اپنی ماں کو کوئی سکھ نہیں دیا۔۔۔"

میں سارا کا یہ خط پڑھ رہی تھی۔ رو رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ اگر خدا صرف موت جتنا سچ بولتا ہے تو خدا کا بنایا ہوا انسان صرف پیسے جتنا سچ بولتا ہے۔۔۔

سارا کے خط کا اگلا حصہ تھا ------

"میرے بھائی آن پہونچے ہیں۔ جائیداد پر جھگڑا ہوا۔ ایک کہے یہ مکان میرا ہے۔ دوسرا کہے' یہ مکان میرا ہے۔ آخر بڑے بھائی نے یہ فیصلہ کر دیا اور بھائیوں میں جائیداد تقسیم کردی۔ میں سوچنے لگی۔ میں اب کہاں جاؤں گی؟ کسی نے نہیں سوچا کہ میں کہاں رہو نگی؟

بھائی نے مجھے تنہائی میں کہا---- شگفتہ! اب اخباروں کے ایڈیٹر'نمائندے' شاعر ادیب اس گھر میں نہیں آسکتے۔

میں نے کہا۔ بھائی صاحب! پہلے بھی ایک آدھ کے علاوہ ہمارے گھر کون آتا تھا۔ میں تو خود کسی سے ملاقات کرنا پسند نہیں کرتی ---

----کوڑے پر لوگ کوڑا پھینکنے ہی آتے ہیں --

سوچتی ہوں امرتا! کیا کروں؟ میری ماں مرگئی ہے امرتا!

آنسو کہیں میرے کپڑوں کا رنگ بدل دیں!

اخباروں میں میرا کوئی بھی کالم چھپے' اسے خاندان کی ذلت سے گردانا جاتا ہے۔

میرے لکھنے پڑھنے کو میرے دماغ کا خلل جانا جاتا ہے۔

ویسے ہی میرا ذہنی توازن درست نہیں' جانے کیا کیا لکھتی جارہی ہوں۔

زمینوں سے پگڈنڈیاں بچھڑ جائیں تو موسم نہیں آتے۔

میں ہمیشہ ٹوٹنے پر اکٹھے کرتی رہی۔

امرتا! تمہیں پورا پورا اختیار ہے میری کتاب چھاپنے کا۔ ضرور شائع کریں۔ بلکہ بہت بہت شکریہ۔ محبت ہوگی۔ جواب جلدی دینا۔ میں بہت اداس ہوں۔

تمہاری اور اپنی امی کی

سارا شگفتہ

اور خط کے نیچے ایک نوٹ تھا۔ ---ذرا ترتیب دے دینا چھاپنے سے پہلے۔ میرا ذہن اس وقت کام نہیں کر رہا۔ تم فوراً" کتاب چھاپ دو۔ میں کل اختیار تمہیں دیتی ہوں۔

یہ لکھتے ہوئے بھی شرم محسوس ہو رہی ہے' ورنہ اپنے سے زیادہ تم سے محبت کرتی ہوں۔

امروز کو سلام

----- سارا"

لگتا ہے ------ سارا نے اس خط کا جو حصہ اپنی امی کی موت کے دن لکھنا شروع کیا تھا ۸ جنوری کو' وہ بہت دن ڈاک میں نہیں ڈالا اور اسی دوران احمد سلیم سے سارا کے ساتھ ہوئے نئے حادثہ کی پریشانی جان کر میں نے سارا کو جو خط لکھا تھا--- ہندوستان آنے کے لئے' وہ اسے ملا ہوگا۔ اسی لئے خط میں ایک اور حصہ درج ہے۔

" میں چالیسویں کے بعد ہندوستان آؤ نگی۔ میرا دل بہت اداس ہے ---

ایک پڑوسن نے کہا -- اب تمہارا کلیجہ ٹھنڈا ہوگیا ہوگا' تمہاری ماں کا تمہاری وجہ سے ہارٹ فیل ہوا ہے ---

امرتا! کیا یہ سچ ہے امرتا؟

امرتا! ماں کی موت سے پندرہ روز پہلے میں نے زہر کھالیا تھا امرتا! مجھے جناح اسپتال داخل کر دیا گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے میری ماں سے کہا تھا۔ اس کے بچنے کے کوئی چانس نہیں۔ شگفتہ کے کفن دفن کا انتظام کریں۔

میری ماں بہت روئی تھی امرتا! اب میرے لہو میں ماں کے آنسوؤں کے آخری قطرے دوڑتے ہیں۔

میرے لہو میں ماں کے آنسو رہ گئے ہیں امرتا!

تم میری دوست ' مجھے بتاؤ ! امرتا! کیا میں اپنی ماں کا آخری دکھ ہوں؟ بتاؤ امرتا! میری امرتا! اب میں کبھی خود کشی نہیں کروں گی اس لئے کہ میرے چھوٹے بھائی کی بھی ماں مر گئی ہے۔ اس کا بھی کوئی نہیں۔ میں اپنی ماں کی نشانی اپنی روح میں رکھوں گی ---

تمہاری سارا

اور کاغذ کے بازو میں لکھا تھا ۔ میرے خط ' خود نوشت ' نظمیں جلد شائع کردو۔ کبھی کبھی میرا سانس بھی رک جاتا ہے ۔ امرتا! امرتا! میری امی ---

چوڑیاں جب کسی عورت پر قہقہے لگاتی ہیں' تو وہ چوڑیاں کانچ کی ہوں' ہاتھی دانت کی یا سونے چاندی کی' ان کے قہقہے ایک سے ہوتے ہیں۔ اور وہ گھروں کی دیواروں سے لپٹ نہیں رہتے -- بازار میں پہونچ جاتے ہیں ---

سارا کا ایک اور خط ملا' بہت مہینوں کے بعد اس پر ۷ فروری ۱۹۸۳ء کی تاریخ تھی۔ لکھا تھا۔

امرتا!

ابھی امی کے انتقال کو چند روز ہی ہوئے تھے' سارا خاندان اکٹھا تھا' امی کا کمرہ خالی تھا' اور بھرا ہوا تھا۔ میں آنگن میں بیٹھی تھی۔ میرا بہنوئی آیا اس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ اس نے اخبار مجھے دیا۔ اور کہا' پڑھو میں نے اخبار لیا اور پڑھنے لگی۔

ا۔ سارا شگفتہ نے اپنے چوتھے شوہر سے بھی طلاق لے لی۔

۲۔ سارا شگفتہ کی والدہ یہ صدمہ برداشت نہ کر پائی۔ حلقے والوں کا کہنا ہے کہ انکی موت اس صدمے سے ہوئی۔

میں نے اخبار میز پر رکھ دیا۔

پھر یہ اخبار سارے خاندان کو پڑھایا گیا۔

سارا کی زندگی کے حالات یہاں درج کرتے ہوئے ہیں نہیں چاہتی کہ اپنی زندگی کا کوئی واقعہ اس میں شامل کروں' لیکن سارا کا یہ خط پڑھتے ہوئے' یہ جو ۱۹۸۴ء کا سال تھا' اس نے ایک کروٹ لی اور قریب بیس سال پیچھے جاکر کھڑا ہوگیا۔

جب میں ٹھیک انہی حالات سے گذر رہی تھی۔ تو ٹھیک یہی سرخیاں تھیں کسی اخبار کی ۔ جن میں صرف نام کا فرق تھا' وہاں سارا کی جگہ امرتا لکھا ہوا تھا۔

اور میں نہیں جانتی کہ ایسی سرخیوں کا زہر سارا نے کس طرح پیا ہوگا' لیکن یہ جانتی ہوں کہ جس دن سارا کا یہ خط آیا' مجھے لگا کہ اخباروں کی ایسی سرخیوں کا زہر میں آج دوسری بار پی رہی ہوں ---

اس واقعہ کی خط میں اور تفصیل تھی۔

"جس مکان میں میں اور امی رہتے تھے' وہ مکان امی کے نام پر تھا۔ بڑے بھائی نے کہا اب یہ مکان شگفتہ اور خالد' یعنی کہ میرے چھوٹے بھائی کے نام کر دیا جائے۔

میں نے کہا --- مجھے کچھ بھی نہیں چاہئے۔ یہ مکان میرے چھوٹے بھائی کے نام کر دیا جائے

چنانچہ مکان چھوٹے بھائی کے نام لیز کرا دیا گیا۔ اس روز امی کا اکیسواں تھا میرا چھوٹا بھائی اور بہنوئی مجھ سے کہنے لگے ۔ ہم گلیوں محلوں میں نکلتے ہیں تو لوگ ہمیں اخبارات دکھاتے ہیں باتیں بناتے ہیں۔ تمہاری موجودگی میں ہم اب اس مکان' اس محلے میں نہیں رہ سکتے یا تم اس گھر سے چلی جاؤ یا ہم چلے جاتے ہیں ۔ تم نے چوتھی طلاق لی ہے۔ اب

ہمارا تم سے کوئی تعلق نہیں ---

چھوٹے بھائی نے یہ بھی کہا--- ماں تھی تو اور بات تھی۔ تمہاری آزادیاں، سگریٹ پینا ہم برداشت کئے ہوئے تھے۔ ماں کے مرنے کے بعد تم ہمارا کیا خیال کرو گی۔ تمہیں تو خود پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں-----

میں پھر آنگن میں آکر بیٹھ گئی۔ کمرے سے آوازیں آتی ہیں۔

۱۔ میرا خیال ہے شگفتہ کو پاگل خانے داخل کرا دیا جائے' جہاں سے یہ کبھی نہ نکل سکے اور کاغذ قلم پر پابندی لگا دی جائے۔

۲۔ خاندان کو تو اس نے اخبار کی سرخیاں بنا رکھا ہے۔

۳۔ ہماری ماں کو اس نے بہت دکھ پہونچائے ہیں۔

۴۔ یہ کب یہاں سے جائے گی۔

میں نے اپنی کتابیں اٹھائیں اور پڑوس میں رکھ دیں ایک اٹیچی کیس اٹھایا' ماں کے گھر کو دل میں رکھا اور چل پڑی۔

جانا کہاں ہے؟ پھر یہ سوال کرتے ہیں---- کسی شاعر' ادیب کے گھر؟ تو کل کے اخبار میں یہ خبر چھپے گی سارا شگفتہ آج کل فلاں شاعر یا ادیب کو داد دے رہی ہے----

کہاں جاؤں؟ رشتے داروں کے یہاں؟ لیکن میں اور ماں تو اکیلے رہتے تھے۔ ہمارا کوئی رشتہ دار نہیں تھا۔ لوگوں نے تو میرے شعر بھی دیواروں سے کھرچ ڈالے تھے کہ دیواروں پر بھی یہ نشانیاں نہ رہیں۔

میرے ہاتھ میں کپڑوں کی ایک گٹھڑی بھی تھی جس میں میری ماں کے وہ کپڑے تھے جو زندہ رہ گئے تھے----

میری آنکھیں ننگی ہوتیں تو آنسو انہیں ڈھانپ دیتے ایک آواز اور بھی تھی----

اس نے تو لکھ لکھ کر سارے خاندان کو رسوا کردیا ہے اب تم لوگ بھی یہ کام کرو کہ اخبار میں نکلوا دو کہ سارا شگفتہ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔

ماں کی کوکھ سے گرے ہوئے سکے پہلے تو کبھی نہیں کھے تھے۔ دل نے کہا ہر پرندے کی زبان سیکھ کر جنگل جانا۔ میں اپنی ایک دوست کے یہاں چلی آئی۔ ثروت سلطانہ کے یہاں ۔ فی الحال یہیں رہ رہی ہوں۔

میں اپنے چھوٹے بھائی سے بہت محبت کرتی ہوں---- لیکن بھیا! چالیس دن تک

تو میرے آنسوؤں کو مرنے دیتے۔ پھر میں ہوتی اور ان آنسوؤں کی تقدیر۔
مجھے دکھ ہے بھیا کہ میں تیرے کھلونے توڑتی رہتی ہوں میں آج بھی کھلونے توڑ رہی ہوں بھیا! اور اس وقت تک کھلونے توڑتی ہوں گی جب تک انسان جوان نہیں ہوجاتا۔
تم نے میرے اور اپنے درمیان ایک مکان چن دیا ہے۔
اگر دوسری منزل بنانے کا ارادہ ہے تو مجھ سے آنکھیں لے جانا۔ میرے ہاتھ لے جانا میرے قدم لے جانا۔ میرے جذبے لے جانا۔ میرا جی چاہتا ہے بھیا! تیرا گھر بہت وسیع ہو۔
امرتا! لگایا آگ میں بھی قہقہہ کے انگار کے ساتھ----
امرتا! حشر کا میدان یہاں سے کتنی دور رہ گیا ہے کہ خدا نے میری ماں کا نام پکارنا ہے۔ میں نے اپنی امی سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔
پہلے میں مٹی کو ماں سمجھا کرتی تھی لیکن جب سے موت میرے دل پر اتری ہے کوئی پودا ہرا نہیں ہوا------
جب سے موت میری ماں کے ساتھ سچ بول کر گئی ہے' میری ماں مجھ سے بولتی نہیں۔
---- اب اس نے کبھی نہیں کہا----- شگفتہ بیٹی! لکھتے لکھتے تیرے ہاتھوں میں ورم آجاتا ہے۔ مت لکھ۔ سوجا بیٹی تمام رات لکھتی رہتی ہے۔ تھوڑی دیر آرام کرلے۔
وہ آواز جو مٹی کے نصیب میں لکھ دی گئی ہے۔
اور مٹی اپنے ہاتھ کھولے مجھ پر خاج اڑا رہی ہے۔
حشر کے روز مٹی موت سے بیدار ہوگئی
اور بچے جانتے ہیں کہ ازل سے ہے کوئی ماں نہیں لوٹے گی----
اب میں اپنی چوڑیوں سے کس کو زخمی کروں گی ----
لہو کی بوند ہر رنگ کی گواہی نہیں دیتی----
سورج خاک چھان پر اپنا خون بہانے لگتا ہے----
رات میں اپنا منہ کالا کرتا ہے' روز مرتا ہے----
امرتا! جھوٹا تعلق مجھ سے نہیں رکھا جاتا لوگ ستر ستر سال گذار دیتے ہیں ایک ساتھ' لیکن دل میں ان کے کینہ ہوتا ہے یہ کب اسلام نے کہا ہے کہ تم جبر کے تحت زندگی گزارو۔
اگر عورت کو یہ لوگ ایک ہی جگہ پر مرکھپ جانے کو کہتے ہیں تو اسلام میں طلاق

کیوں رکھی گئی ؟

میں انسان ہوں جائیداد نہیں اور اگر کوئی مجھ، یعنی عورت کو انسان نہیں سمجھتا تو وہ آدمی زیادہ دنوں تک عورت کے دن پر نہیں بھونک سکتا۔ ـ ـ ـ ـ

امرتا! اسی کا مجھے بہت دکھ ہے۔ رہی بات گھر کی کچھ نہ کچھ کرلوں گی۔ ـ ـ ـ

بہت اداس ہوں آنکھ کو انگاروں پر آنسو چھڑک رہی ہے۔

تمہاری ۔ سارا شگفتہ

سارا نے جو کچھ کہا۔ ـ ـ ـ باتوں اور خطوں کی صورت میں یا نظموں اور داستانوں کی صورت میں اسی کے لفظوں میں "میرے کھوئے ہوئے خدا، جتنی تیری گلی ہے، اتنا بھونک لیتی ہوں۔ ـ ـ ـ ـ ـ"

لیکن سارا تو کیا، خدا بھی نہیں جانتا کہ دنیا والوں کے گھروں اور بازاروں کا راستہ خدا کی گلی سے نہیں گذرتا۔ ـ ـ ـ

اور سارا کے لفظوں کا حسن نہ کسی نے دیکھا نہ سنا۔ ـ ـ ـ ـ یہ گھروں اور بازاروں والے صرف چوڑیوں کے قہقہے سنتے رہے۔ ـ ـ ـ

زخموں کی گواہی

آدم اور حوا کا ازلی رشتہ جب کسی معاشرہ کے دامن میں بیٹھ جاتا ہے تو جانے خدا ----- اس رشتے کے سارے پھول کانٹے کیوں بن جاتے ہیں----

عورت جب طلاق شدہ ہوتی ہے تو مرد انتقام شدہ ہو جاتا ہے---

سارا کا خط آیا' جس پر ۱۹۸۳ء کے ۲ جون کی تاریخ تھی----

امرتا!

آخری خصم جاگیردار تھا۔ شادی کے چند روز بعد اس کی ذلتوں سے تنگ آکر میں نے بڑی مشکل سے شرعی طور پر طلاق تو لے لی تھی لیکن کچہری کے ڈر کی زنجیر ابھی تک نہیں کھلی تھی-----

ایک دن اس نے پیغام بھجوایا کہ میں تم سے ضروری بات کرنا چاہتا ہوں اور تم ضرور آؤ گی۔

میں گئی۔

"تم نے مجھے کیوں دھتکارا ہے؟ اس لئے کہ میں جاہل تھا۔

اب میں اپنی زمینیں مربعے بیچ کر کتابیں لکھا کروں گا۔ لوگوں سے لکھوایا کروں گا اور تم سے زیادہ مشہور ہو جاؤں گا۔ میں تمہارے خلاف لکھا کروں گا---- اپنی تمام دولت' جاگیر خرچ کروں گا۔ تمہیں ضرور حاصل کروں گا پھر شاید تم مجھے نہیں دھتکارو گی---- میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے پاس رہو۔

ہم عورت کو استعمال کریں تو وہ دوسری چادر تک نہیں پہونچ سکتی----

ہم روز عورت کو خریدتے ہیں اور جب وہ انکاری ہوتی ہے تو اسے قتل کر دیتے ہیں---- اور اس کی کھاد بنا کر پیلیوں میں ڈال دیتے ہیں اور پھر پیلیاں بہت زرخیز ہو جاتی

ہیں----

دوسری بات یہ کہ تم میرے پاس رہو۔ جتنی دولت مانگو' دوں گا-- گاڑی' بنگلہ' گاؤں یعنی کہ ہر چیز اگر تم نہیں مانو گی تو تمہیں قتل کردوں گا۔ تمہاری دونوں ٹانگیں کاٹوں گا' تمہارے دونوں ہاتھ کاٹوں گا جن پر تمہیں اتنا غرور ہے جن سے تم لکھتی ہو اور دنیا کو بے وقوف بناتی ہو----

میں نے کہا---- تمہاری ہیلیوں کی روٹیاں لوگ بڑے دکھ سے کھاتے ہیں اور میری کھاد تمہیں مہنگی پڑے گی۔ میں تمہارے ساتھ چند روز ہی گذار سکتی تھی باقی جبر مجھ پر لازم نہیں تھا۔ مجھے کسی جاگیر' کسی مربعہ کی ضرورت نہیں۔ تم مجھے خرید نہیں سکتے اور یہ تمہاری بھول ہے کہ دولت سے ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔ میں وہ عورت نہیں جو شوہر کے حرم میں سکتی رہتی ہے۔ مجھے اپنے حرم میں رہنے کی دعوت دیتے ہو کتے! تم مجھے دولت کے سنگریزوں میں دفن نہیں کرسکتے۔ قید نہیں کرسکتے---- تم اتنی چھوٹی سی زمین پر مجھے لاگو نہیں کرسکتے---- میرا تم سے کوئی تعلق نہیں۔ آئندہ مجھے بلانے کی کوشش مت کرنا۔ مجھے تمہاری الاٹمنٹ سے نفرت ہے----

اور میں چلی آئی۔

کافی دوستوں کے ذریعہ پیغام بھیجتا رہا۔ کہ شاید عورت اب بکنے پر تیار ہوجائے گی۔

خیر' میں انکاری رہی----

پچھلے دنوں امرتا! جب میں بہت بیمار تھی' ندیم اسپتال میں داخل تھی' پھر کراچی اسپتال میں داخل رہی۔ ایک تو بیماری اوپر سے حرم کی دعوت۔

جاگیردار کو خبر ہوئی کہ میں ندیم اسپتال میں داخل ہوں تو آیا۔ مجھے خون کی بوتل لگی ہوئی تھی۔ کہنے لگے تمہارے اس اسپتال کا خرچ کون دے گا میں اس لئے آیا ہوں کہ تمہیں پیسے کی ضرورت ہوگی-----

اور خون کے قطرے جو میری رگوں میں سرایت کر رہے تھے ایک دم چونٹی' اکنی کی طرح میری رگوں میں چلنے لگے----

یہ خون جو مجھے چڑھ رہا ہے کسی غریب نے نہ بیچا ہو؟

خیر' لہو کے قسم قسم کے قطرے میری رگوں میں اتر گئے۔

میں نے جاگیردار کو دیکھا اور کہا۔ ڈاکٹر میرا علاج مفت کر رہا ہے۔ مجھے کوئی بل نہیں چکانا۔

پھر میں نے زور سے ڈاکٹر کو آواز دی۔ ڈاکٹر اور نرس گھبرا کر میرے کمرے کی طرف دوڑتے آئے۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ ۔ ۔ ۔ اس جاگیردار سے کہو کہ یہاں سے ابھی اسی وقت چلا جائے۔

ڈاکٹر نے اسے اسپتال سے نکال دیا۔ اس پر میں نے ڈاکٹر حق نواز کا بہت شکریہ ادا کیا' اور اب بھی شکریہ ادا کرتی ہوں اور کہتی ہوں ڈاکٹر حق نواز میرے مرنے کے بعد شاید پھر کوئی سارا شگفتہ تمہارے پاس آئے تو اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کرنا۔

اسپتال سے آئے دو روز بیتے تھے کہ جاگیردار کی بھابی میرے پاس آئی۔ بتایا۔ ۔ ۔ ۔ فلاں خالہ بہت بیمار ہے اور تمہیں یاد کررہی ہے اور تم سے ملاقات چاہتی ہے۔

میں نے کہا ۔ ۔ ۔ ۔ کل اس سے ملاقات کرسکوں گی دوسرے روز میں عیادت کو پہونچی دروازہ کھلا تھا۔ دیکھا' کمرے میں کوئی موجود نہیں۔

دوسرے کمرے میں جاگیردار موجود تھا۔ ایک آدمی اور موجود تھا اور اس نے دوسرے مرد سے کہا۔ دوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔

میں نے جاگیردار سے پوچھا۔ مجھے چکر دے کر بلانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس نے ایک ہنکار بھری' بکواس کی اور کہا۔ اب تم اس گھر سے باہر نہیں جاسکتیں۔ کتنے عاشقوں کے خط تمہیں روز آتے ہیں؟

میں نے کہا ۔ ۔ ۔ عاشق؟ میری مٹی اس خوشبو سے غافل رہی ہے۔

اس نے پھر پوچھا ۔ ۔ ۔ رہو گی یا نہیں ؟

نہیں بن مانس ! میں تیرے حرم میں نہیں رہوں گی۔

وہ غصے میں ایک دم کھڑا ہوگیا اور مجھے اتنا مارا کہ میرے جسم پر نیل پڑ گئے ۔

میں برابر اسے گالیاں نکالتی رہی اور جتنا ہوسکا ہاتھ اٹھایا۔

اس نے اچانک تکئے کے نیچے سے چاقو نکالا اور میرے سینے پر وار کرنے لگا۔ میں اوندھی ہوگئی اور وار سے بچ گئی میں جاگیردار کتے کے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتی تھی۔ ۔ ۔ ۔ موت مجھے چھو چھو کر گزرتی رہی۔ میں لڑتی رہی۔ آخر چاقو کا بھرپور وار اس نے میرے سینے پر کرنا چاہا ۔ میں نے ٹانگ آگے کر دی اور میری بائیں ٹانگ پر بھرپور چاقو لگا۔

سارے کمرے میں خون پھیل گیا۔ میں لہولہان ہوئی۔ ۔ ۔ ۔

میں نے زور سے چیخنا شروع کردیا اور میرا شور سن کر ایک پڑوسی کود کر اندر آگیا' اسے دیکھ کر جاگیردار مجھے قتل نہ کرسکا اور بھاگ گیا۔

لہو سے میرے کپڑے بھر گئے تھے اور میں بے جا زخموں سے چور تھی۔ بے ہوش ہوگئی۔

مجھے ہوش آیا' گھر میں کوئی موجود نہیں تھا۔ قتل کے معاملے میں کون پڑتا ہے۔
اور یہ انسانی دور کہا جاتا ہے۔

رات کے دو بجے تھے اور میں سڑکوں پر رینگ رہی تھی۔ خون بہت بہہ چکا تھا۔ میں چل نہیں سکتی تھی میں سڑک کے کنارے بیٹھ گئی۔ انسان برابر سے گذر جاتے تھے' لہو سے ڈر جاتے تھے۔ آخر ایک سکوٹر والے نے مجھے گھر پہ چھوڑ دیا۔ ۔ ۔ ۔

انسان سے ملاقات ہوگئی تو کچھ سانس ٹھہرا۔ گھر والوں نے مجھے لہو لہان دیکھا تو پوچھنے لگے کیا بات ہے؟

میں نے زخم چھپا لئے اور کہا۔ آپ تو جانتی ہی ہیں مجھے خون کی الٹیاں آتی ہیں۔
اپنے کمرے میں گئی' کپڑے تبدیل کئے اور بستر پر بے ہوش سی پڑ گئی۔ ۔ ۔ ۔

سارا کم بخت اسی معاشرہ سے انصاف چاہتی تھی ۔ جس معاشرے کے ہاتھوں ستائی ہوئی تھی۔ اگرچہ جانتی تھی ۔ ۔ ۔ "عدالت زر کی زبان میں مکالمہ کرے گی۔" پھر بھی سوچ رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔

"جاگیردار! تو دولت سے لڑے گا تو میں قلم سے لڑوں گی۔"

سارا نے ہی خط میں لکھا۔ ایس ایچ او بولا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "ایک بات ہے' تیری طرف سے کوئی گواہی نہیں۔ دو گواہیاں پیدا کر۔"

اور سارا نے کہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "سچے گواہوں کی تلاش آپ کا کام ہے میرا نہیں' اور جھوٹے گواہ میں پیش نہیں کروں گی۔ کون میرے زخموں کی گواہی دے گا؟"

اور سارا نے مجھے لکھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زخم مجھے لگا ہے۔ انسانوں کی کائنات کیسے تڑپ سکتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ امرتا! ہندوستان کے تمام اخبارات میں یہ سرخیاں چھپوا دے۔ ۔ ۔ ۔

اور میں تڑپ گئی ۔ ۔ ۔ ۔ سارا! ہندوستان کے اخبار تو کیا پوری دنیا کی اخباریں اسی معاشرے کا حصہ ہیں جس معاشرے کے ہاتھوں تم ستائی جاتی ہو۔ ۔ ۔ ۔ اور خدا کی عدالت کے سوا کوئی عدالت نہیں۔ ۔ ۔ ۔ جہاں صرف سچے گواہ پیش ہوتے ہوں ۔ ۔ ۔ ۔

حوا کا خط آدم کے نام

۱۹۸۰ء میں میں نے کچھ خط لکھے تھے۔ ۔ ۔ ۔ آج کا خط کل کے نام' لفظ کا خط روشنائی کے نام' مذہب کا خط پیروکار کے نام' ہیر کا خط چاچا کیدو کے نام' اور انھیں خطوط میں ایک خط تھا "حوا کا خط آدم کے نام"۔

وہ سبھی ستمبر ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئے تھے۔ لیکن جب ۱۹۸۳ء میں ۲ جون کا لکھا ہوا سارا کا خط آیا' جس میں جاگیردار کے ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا تھا۔ "عاشق' میری مٹی اس خوشبو سے غافل رہی ہے۔ ۔ ۔ ۔ " تو خط پڑھتے ہوئے مجھے لگا کہ آج سے قریب تین سال پہلے میں نے جو خط لکھا تھا' حوا کا خط آدم کے نام' اس میں حوا کا نام لکھنا بھول گئی تھی۔

لگا حوا کا نام سارا ہے۔

میرا خط آدم کو محبوب کہہ کر مخاطب ہوا۔ ۔ ۔ ۔

"میرے محبوب! مخالفت کے اتھاہ پانی میں آج میری حالت اس ٹوٹی ہوئی کشتی کی طرح ہے' جو ابھی کچھ لمحوں کے بعد اسی پانی میں غرق ہو جائے گی۔

تم جانتے ہو۔ ۔ ۔ ۔ ڈوبتی کشتیوں سے جب کنارے کھو جاتے ہیں تو آخری پیغام کسی بوتل میں ڈال کر بوتل کو پانی کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔

وقت کے بھنور مجھے ڈبو رہے ہیں۔ لیکن ایک پیغام بوتل میں ڈال کر وقت کے حوالے کر رہی ہوں کہ وہ اتنا قہر کرنے کے بعد ایک کرم کر دے گا کہ میرے پیغام والی اس بوتل کو اس کنارے پر لے جائے گا۔ ۔ ۔ ۔ جہاں تم رہتے ہو۔

کہتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ایک جاپانی ملاح نے ۱۷۸۴ء میں اپنی کشتی ڈوبنے کے وقت جو آخری پیغام بوتل میں ڈال کر پانی کے حوالے کیا تھا' وہ بوتل ڈیڑھ سو سال کے بعد ۱۹۳۴ء

میں جاکر کنارے لگی تھی۔

خدایا! کیا میرا یہ پیغام بھی تب کسی کنارے پر لگے گا جب میں کسی گذری ہوئی نسل کی کہانی بن جاؤں گی۔

شاید یہ آخری پیغام صرف وقت کا حوالہ ہوتے ہیں' کسی مدد کے لئے کسی تک نہیں پہونچتے' یہ صرف موت کی تصدیق ہوتے ہیں۔۔۔۔

اگر اس پیغام کو حیاتی کا کنارا نہ ملا' یونہی پانی کے رحم و کرم پر رہتے ہوئے اسے صدی بیت گئی تو جب کبھی کنارے پر لگے گا وقت کی نسل اس حقیقت سے واقف ہوگی کہ کبھی اس طرح بھی کشتیاں ڈوبتی تھیں' اور لڑکیوں کی حیاتی اس طرح سے غرق ہوجاتی تھی۔۔۔۔

میرے سپنوں کی ہری وادی ۔ میلوں' کوسوں تک بچھا ہوا پانی بن گئی' جب ہر کسی کی مخالفت ایک دریا کی طرح بہتی ہوئی اس میں ملنے لگی اور میرے بیاہ کی شہنائی بجنے لگی تو پانی میں بھنور پڑنے لگے۔۔۔۔

بھرے ساگر میں جن کی کشتیاں ڈوبتی ہیں' ان کا جنازہ کوئی نہیں اٹھاتا۔ لیکن جب معاشرے کے دریا میں کوئی کشتی ڈوبتی ہے تو اس کی ڈولی اٹھائی جاتی ہے۔۔۔۔

دیکھ! میری ہاتھوں پر مہندی لگی ہے اور مجھے ڈبونے والے پانی کی ہر لہر میری موت کی خوشی میں ہنس رہی ہے۔۔۔۔

تم خود کو آدم کہتے تھے اور مجھے حوا۔۔۔۔۔ لیکن دیکھ! کبھی وقت تھا جب حوا کو خدا کے بہشت سے نکلنا پڑا تھا اور آج وہ وقت ہے جب حوا کو آدم کے بہشت سے نکلنا ہے۔۔۔۔۔

طوفان اٹھنے والا ہے۔۔۔۔ شہنائی کی آواز کالی سیاہ گھٹا کی طرح اٹھ رہی ہے اور میرے سر پر اوڑھی ہوئی کناری والی چنری۔۔۔۔ آسمان میں بجلی کی طرح چمک رہی ہے۔۔۔۔

سارا کا چوتھا نکاح' کہتے ہیں' اس کے ہوش و حواس میں نہیں ہوا تھا۔ اسے پاگل خانے سے آئے دو یا تین روز ہوئے تھے جب ماں نے ڈاکٹر کے کہنے پر چاہا کہ سارا کی شادی کروی جائے۔ شادی کا لفظ سنتے ہی سارا کی جو آواز کالی پڑ گئی تھی' اس آواز نے قبول' قبول کس طرح کہا ہوگا۔۔۔۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔۔۔۔۔

شادی تو بستر میں پہنچ جانے کا ایک حادثہ تھی' لیکن جو سارا عبادت کے لئے غار نہیں' انسان چاہتی تھی اور تلاوت کے لئے انسانی صحیفہ' اس صحیفہ کی ایک آیت جیسی سارا کے ذہن میں انسان کو جو تخیل ہوگا ۔ ۔ ۔ وہ ضرور حوا کے ذہن میں آدم کے تخیل جیسا ہوگا۔

مجھے لگا۔ ۔ ۔ ۔ ہر نکاح اور ہر طلاق کے بھنور سے گاتی ہوئی سارا کی نظمیں اپنے آدم کے نام وہ پیغام ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ جو اپنی ڈوبتی ہوئی کشتی سے ' اس نے ایک بوتل میں ڈال کر ۔ ۔ ۔ ۔ سمندر کے حوالے کردیا۔ سے کے حوالے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور لگا' وہ جو خط تھا۔ ۔ ۔ ۔ حوا کا خط آدم کے نام' وہ سارا نے ہی میرے قلم سے لکھا تھا۔ ۔ ۔ ۔

بنجر پیاس

یقیناً" کانٹوں کا احساس اتنا ہی قدیم ہوگا جتنا پھولوں کا" لیکن اس کے درد کی شدت کسی کو تب ہی جان پڑتی ہے جب کوئی اسے اپنے بدن پر جھیلتا ہے۔

یہ ۱۹۸۳ء کا سال میرے لئے ایک بہت کڑا وقت لے کر آیا۔ دیکھا۔ - - میری چھوٹی یا بڑی جتنی بھی دنیا تھی وہ دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ اپریل ۱۹۸۲ء میں جس دن سے میرے لئے بھارتیہ گیان پیٹھ کا اوارڈ اناؤنس ہوا تھا ٹھیک اسی دن سے میری دنیا دو حصوں میں تقسیم ہونی شروع ہوگئی تھی' لیکن اپریل ۱۹۸۳ء میں جب ایوارڈ ملا تو اس تقسیم کا درد پوری طرح نمایاں ہوگیا۔ میری دنیا کا ایک طرف وہ تھا جو میرے ہاتھ میں محبت کے پھول دے رہا تھا۔ - - - اور دوسرے حصہ وہ تھا' جو میرے پیروں کے سامنے دشمنی کے کانٹے بچھا رہا تھا۔ - - -

میں ایک ہاتھ میں لوگوں کی محبت کے پھول تھام رہی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اپنے پیروں سے بہتا ہوا لہو پونچھ رہی تھی' جب سارا کے گھبرائے ہوئے خط ملے۔ اور جواب میں میں نے اسے ہندوستان آنے کے لئے لکھا۔ اور کوئی راہ نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ یہ بھی پتہ چلا کہ علیہ نام کی کوئی لڑکی سارا کو محبت اور عزت سے کچھ دن اپنے ساتھ رکھ سکتی ہے۔ اس لئے سارا کو یہ بھی کہلوایا کہ وہ جب تک ہندوستان نہیں آسکتی تب تک علیہ کے پاس رہے۔ جواب میں ۲ اگست ۱۹۸۳ء کا لکھا ہوا سارا کا خط آیا۔

"امرتا! یاد بہت آتی ہے۔ طبیعت پہلے سے ٹھیک ہے بھی اور نہیں بھی۔ آج ثروت کو سلیم کا خط ملا کہ امرتا کا حکم ہے کہ سارا علیہ کے گھر پر رہے۔ اب میں علیہ کے یہاں رہ رہی ہوں۔ جلد ہی ہندوستان آرہی ہوں بس کچھ طبیعت سنبھل جائے۔ پھر اپنی امرتا سے صدیوں باتیں ہوں گی۔ - - -"

مجھ پر آئے ہوئے کڑے وقت میں۔ ۔ ۔ ۔ ایک حادثہ یہ بھی شامل ہو گیا کہ جون کے آخری ہفتہ میں میں فرانس گئی تھی اور وہاں ایک چھوٹے سے حادثہ سے تیسرے روز ہی میرے دائیں کندھے کے پاس تین فریکچر آ گئے کہ کچھ دیر مجھے اسپتال میں رہنا پڑا' پھر وہیں ایک ہوٹل میں۔ آٹھ دن کے بعد مشکل سے واپسی کا سفر طے کیا' لیکن اسپتال کی روزانہ پٹی کے باوجود یہ خطرہ ہوا کہ اب میرے بازو کی ہڈی شاید کبھی نہیں جڑ پائے گی اور میں اپنے ہاتھ میں اپنا قلم کبھی نہیں اٹھا پاؤں گی۔ ۔ ۔ یہی وجہ تھی کہ اب میں اپنے ہاتھ سے سارا کو خط نہیں لکھ پا رہی تھی اور اس حادثہ کی خبر بھی اسے نہیں دینا چاہتی تھی۔ ۔ ۔ ۔

اس دوران ۵ اگست کا لکھا ہوا سارا کا خط ملا۔

امرتا! چند روز پہلے یونیورسٹی کے کچھ شاعر نما لڑکوں نے کہا۔ ۔ ۔ سارا صاحبہ! نشست ہے آپ کے اعزاز میں! بڑی ضد کے بعد میں نے کہا۔ ۔ ۔ اچھا! گئی تو اکیلا گھر' اور ایک نما لڑکا۔ مجھے کہنے لگا۔ کافی بکواس کے بعد' ایک رات میرے ساتھ گذاریئے۔ میں نے کہا۔ "اگر یہ رات تمہارے ساتھ گذار لی تو باقی راتیں کس کے ساتھ گذاروں گی؟" اور گناہ کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے۔ ؟"

میں اپنے ٹوٹے ہوئے بازو کے ساتھ' لٹکتے ہوئے اپنے ناکارہ ہاتھ سے نہ اپنے پیروں کا لہو پونچھ سکتی تھی نہ سارا کے پیروں کا۔ تڑپ کر رہ گئی۔ اور کیا پاکستان کے اور کیا ہندوستان کے ان شاعر نما' ادیب نما' دوست نما لوگوں پر لعنت بھیجتی رہی۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ان دنوں احمد سلیم ہندوستان آیا ہوا تھا۔ اس کی واپسی سے سارا کو میرے حادثے کی خبر ہوئی اور ۵ دسمبر ۱۹۸۳ء کا لکھا ہوا مجھے سارا کا خط ملا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ خط سارا نے پنجابی میں لکھا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"امرتا! اجے تک ہتھ ٹھیک نہیں ہویا۔ میتوں لگدا اے امرتا کہ ایہہ کوئی ڈاڈھی پیڑ اے۔ میری ایس سوچ نوں سپ لڑے۔ ایہہ دکھ کن کول واگوں میں نوں کھبیا ہویا اے۔ میں نوں لگدا اے۔ بڑا کچھ توں وی میرے کولوں لکاندی پئی اے! ڈاکٹر آنہدے نے؟ ڈاکٹری رپورٹ میتوں چھیتی نال بھیج دے! ایہہ ہویا کی؟ میتوں کوئی بھی چج گل نہیں دسدا!" ایہہ سوچ کے سارا پریشان ہووے گی۔

کتاب واسطے شکریہ دا لفظ چھوٹا اے۔ کی لکھاں! میری کتاب نوں تو میری سوچ توں وی وڈا چھاپیا اے۔ امروز دیاں محبت نے وی کاغذ خاکے بنا دتے۔ پتہ نہیں لگدا کہ میرے

لفظ وڈے نے کہ آرٹسٹ وڈا اے۔

بن کجھ دناں تو سارا نے اپنی بجھ پیاس دا پیالہ بھن دتا اے۔ میں کسی نال ملاقات نہیں کردی۔ کاغذی لوکاں نال نہیں ملدی۔"

اس پنجابی میں لکھے ہوئے خط کے بعد سارا نے مجھے لکھا۔

امرتا!

امروز کا خط ملنے کے بعد سے میں نے کچھ بھی نہیں لکھا۔ امرتا! میں کچھ لکھ ہی نہیں سکتی تھی کاغذوں پر میرا ٹوٹا ہوا بازو پڑتا ہے امرتا! میں بہت پریشان ہوں امرتا مجھے بتاؤ' میرا بازو اب کیسا ہے۔ امرتا! میں اس وقت تک کچھ نہیں لکھوں گی۔ اور نہ لکھا ہے جب تک تمہارا بازو ٹھیک نہیں ہوجاتا۔ چاہے۔ تمام عمر یونہی کٹ جائے۔

میں اپنے دکھ کی پستی کو بس اتنا ہی جان سکتی ہوں امرتا کہ میں اس وقت تک نہیں لکھوں گی' جب تک تمہارا بازو ٹھیک نہیں ہوجاتا۔ میں نے ہمیشہ تمہیں دکھ دیئے ہیں امرتا! مجھے اپنی خیریت سے جلد اطلاع دوں!

امروز کو سلام!

تمہاری ۔ سارا شگفتہ

۱۴-۹-۸۴

میں نے جواب میں امروز سے خط لکھوایا۔

"پگلی لڑکی! جب تک میں ہاتھ میں قلم نہیں پکڑ سکتی تب تک تو نے ایک ہاتھ سے نہیں' دو ہاتھوں سے لکھنا ہے۔ ایک ہاتھ سے اپنی طرف سے اور دوسرے ہاتھ سے میری طرف سے-----

میرا بازو ڈاکٹروں سے ٹھیک نہیں ہوسکا تھا۔ آپریشن کا خطرہ سامنے تھا کہ اچانک ایک حکیم صاحب نے پٹی کرنی شروع کی اور میرا درد روز بروز کم ہونے لگا پتہ چلا کہ حکیم صاحب کو ایک بخشش ہے کہ ان کے ہاتھ سے ٹوٹی ہوئی ہڈی جڑ جاتی ہے۔ بہت پوچھنے پر حکیم صاحب نے بتایا کہ ایک مسلمان فقیر نے انہیں یہ وردان دیا تھا۔ اور یہی مہینہ تھا دسمبر کا جب میرے بازو کی ہڈی خود بخود جڑ گئی------

اب میں قلم پکڑ سکتی تھی' لکھ سکتی تھی لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ ایک دن اسی ہاتھ سے سارا کی زندگی پر مجھے یہ نامراد کتاب لکھنا ہوگی-----

کر بسم اللہ کھول دیں میں نے
چالیس گانٹھیں

ایک وقت تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب پنجاب میں ساندلبار کے علاقہ میں ایک روایت ہوتی تھی۔ ۔ ۔ ۔ گانٹھیں۔

جب کسی کی شادی طے ہوتی تو علاقے کا مولوی دو رسیاں۔ لے کر مقررہ دن میں جتنے دن باقی ہوتے' اتنی گھانٹھیں ڈال دیتا ایک رسی لڑکی کے قبیلے کو دے دی جاتی اور دوسری رسی لڑکے کے قبیلے کو' اور وہ دونوں قبیلے اپنی اپنی رسی لڑکی اور لڑکے کے ہاتھ میں دے دیتے جو روز صبح اس رسی سے ایک گانٹھ کھول دیتے' اور آخری گانٹھ جس روز کھولی جاتی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس روز شادی کی شہنائیاں بج اٹھتی تھیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس روایت کو بعد میں پنجاب کے صوفی شاعر بلھے شاہ نے اپنی نظم میں کہا' روحانی رنگ میں کہ وہ روز صبح زندگی کی رسی سے ایک گانٹھ کھولتا ہے اور دیکھتا ہے کہ خدا کے وصل میں کتنے دن باقی رہ گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بلھے شاہ کا ہی شعر ہے ۔ ۔ ۔ کر بسم اللہ کھول دیں میں نے چالیس گانٹھیں۔ ۔ ۔

ہو سکتا ہے کہ یہ شعر اس نے اپنی چالیسویں جنم دن پر لکھا ہو۔ ۔ ۔ ۔

اور جب ۱۹۸۴ء میں ۷ جون کے دن کراچی سے فون آیا کہ سارا شگفتہ نے ۴ اور ۵ جون کی رات ریلوے لائن پر خودکشی کر لی تو تڑپ کر میرے منہ سے نکلا۔ ۔ ۔ دوست! زندگی کی گانٹھ ایسے کھولتے ہیں ؟

سارا ابھی پورے تیس برس کی نہیں تھی۔ ۔ ۔ ۔

کمبخت نے خود ہی لکھا تھا۔ ۔ ۔ "قدم دروازے سے اونچا نہیں' دل کائنات سے

چھوٹا نہیں۔۔۔۔" پھر بھی وہ زندگی بھر دروازوں کو آزماتی رہی۔۔۔۔

اور دنیا کے یہ دروازے۔۔۔۔ نکاح' لفظ کو استعمال کرتے اور سارا کے قدم کو خوش آمدید کہتے۔ لیکن یہ کسی دروازے کے بس کی بات نہیں تھی کہ وہ سارا کے کائنات جتنے بڑے دل کو خوش آمدید کہہ سکتا۔۔۔۔

سارا کے قدم جس بھی دروازے کے اندر داخل ہوتے' وہ دروازہ بھی پریشان ہو اٹھتا اور سارا کے قدم بھی۔۔۔۔ اور پھر وہی قدم طلاق' لفظ کی ٹھوکر کھا کر تڑپتے ہوئے اس دروازے سے باہر نکل جاتے۔۔۔۔

یہ سب تھا۔۔۔۔ لیکن میں نہیں جانتی تھی کہ اس نامراد زندگی کا دروازہ بھی اتنا چھوٹا ہوگا کہ ساری کائنات جیسے بڑے دل کو وہ اپنی بانہوں میں نہیں لے سکے گا۔۔۔۔

اور سارا کو زندگی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی۔۔۔۔ پھر سے ہوا' پانی اور آکاش جیسی کائنات کی شکلوں میں لوٹ جانا پڑے گا۔۔۔۔

انسانی صحیفہ

"کسی کی چیز کھوئی میں ڈھونڈنے والوں میں شامل ہوں۔" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سارا نے یہ نظم لکھی، لیکن چیز لفظ کی تشریح نہیں کی۔ کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ یہ انسان کی انسانیت تھی جو کھو گئی تو سارا ڈھونڈنے والوں میں شامل ہو گئی۔

یہ بات الگ ہے کہ اسے ڈھونڈنے والے دنیا میں بہت نہیں ہے۔ لیکن جتنے بھی ہیں محض کچھ ایک سارا ان کچھ ایک میں سے تھی۔ اور انسانی صحیفہ لکھنے کی جرات کرنے میں بالکل اکیلی۔

اس نے کتنی بار تڑپ کر کہا۔ ۔ ۔ ۔ "روحیں جسموں سے آنکھیں مانگ رہی ہیں۔"

اور اپنے جیسی کسی ایسی روح کی تلاش کرتی رہی، جسے آنکھیں نصیب ہو گئی ہوں۔

مجھے یاد آتا ہے۔ جب اس سے ملاقات ہوئی تھی ۱۹۸۰ء میں تو وہ کتنی دیر امروز کی ایک پینٹنگ کے سامنے کھڑی رہی۔ اس پینٹنگ میں انسانی وجود کا ایک احساس سا نظر آتا ہے جس پر آنکھیں ہی آنکھیں نمایاں ہیں۔ پوچھنے لگی۔ ۔ ۔ ۔ "اس پینٹنگ سے مصور کی کیا مراد ہے؟ میں نے ہنس کر کہا۔ ۔ ۔ ۔ "کسی بھی چیز کو دیکھنے والے کی آنکھ ارتھ دیتی ہے۔"

وہ بہت دیر تک کھڑی رہی اور کہنے لگی۔ ۔ ۔ ۔ "ہو سکتا ہے، یہ بڑی شدت سے کسی کے انتظار کو پیش کرتی ہو۔ ۔ ۔ ۔ انتظار ۔ ۔ ۔ ۔ جب سارے وجود پر آنکھیں اگ آتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ " اور پھر آہستہ سے کہنے لگی۔ ۔ ۔ ۔ "مجھے لگتا ہے۔ ۔ ۔ جیسے کسی روح کو آنکھیں مل گئی ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

شاید وہی پل اس کے ذہن میں کہیں کھڑا رہ گیا تھا کہ برسوں بعد اس نے نظم لکھی ۔ ۔ ۔ "روحیں جسموں سے آنکھیں مانگ رہی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ " اور کوئی انسان جس محبوب

چہرے کو، اپنی روح کی آنکھ سے دیکھنا چاہتا ہے، وہ نہیں دکھائی دیتا تو ضرور اسی کا حوالہ ہوگا سارا کی نظم میں، جب اس نے لکھا۔ ۔ ۔ "چلو تیرے رنگ کی آگ جلا لیتے ہیں۔"

اور سارا نے جو اس کے رنگ کی آگ جلائی، اسی کا نام انسانی صحیفہ، یہ انسانی صحیفہ کبھی دنیا کے سامنے آسکے گا یا نہیں، میں نہیں جانتی لیکن اس نام پر سارا نے جو کچھ لکھا، میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ کاغذات صحیح سلامت ہیں۔ سارا نے مجھے ۱۹۸۳ء میں ۲۷ اپریل کے خط میں ان کاغذات کا پتہ ٹھکانا لکھا تھا کہ وہ کراچی میں کس جگہ پڑے ہیں۔ ایک طرح سے زمین دوز ہیں ۔ لیکن وہ سب یہاں لکھنا مناسب نہیں ہوگا۔ وہ غلط ہاتھوں میں بھی جاسکتے ہیں اس لئے میں کچھ نہیں کہنا چاہتی، صرف اتنا کہ وہ ہیں۔ اور ان میں ضرور خدا جیسے محبوب کے رنگ کی آگ ہوگی۔

اے خدا!

خدا کی عبادت کا اتہاس اتنا لمبا ہے' جتنا انسان کے ذہن میں خدا کا تصور ----
اس اتہاس میں اگر کچھ بدلتا ہے تو عبادت کا انداز بدلتا ہے۔ بت پوجا سے لے کر بت شکنی تک یہ انداز بدلتے ہیں' لیکن ہر انداز کو عبادت کا لقب ضرور نصیب ہوتا ہے۔
یہ حرف اگر نہیں نصیب ہوا تو سارا کی عبادت کو' جس نے سجدے میں جھک کر نہیں' خود سجدہ ہو کر کہا۔---

اے خدا! کیا میں تیری زکوٰۃ ہوں؟ یا ایک سجدہ ہوں؟
اے خدا! تو میرا انکار ہے' اور میں تیرا اقرار ہوں۔---
اے خدا' چھاتیوں سے لے کر ایڑیوں تک میں تیری ہوں
میں نادانی سے بچے جنتی ہوں
اور فضل سے حکم جنتا ہے۔---
اے خدا! میں اپنی کوکھ سے چلتی
اور تیرا نام جنتی
اے خدا! میں نے اپنی نسل پر تیرا نام لکھا ہے۔---

سارا شاید جانتی تھی کہ جس نے اپنی نسل پر خدا کا نام لکھا ہے اس کی اس جرات کو عبادت کا نام دیا جائے گا۔ اور شاید اس لئے وہ ہنس دی کہنے لگی۔
اے خدا! میں بہت کڑوی ہوں' پر تیری شراب ہوں۔
اور اس شراب کا گھونٹ پینے کے لئے ہونٹوں کو اس انسان کی ضرورت تھی' جس

انسان میں خدا بستا ہو۔ اور وہ انسان کہیں نہیں تھا۔۔۔

سارا نے جانے کس الہی سے محبت سے کہا تھا۔۔۔ "اے خدا! تو چاند کی سیاہی سے رات لکھتا ہے۔۔۔۔" لیکن خدا کے بندوں نے رات کی سیاہی سے سارا کے دن لکھ دیئے۔

دو سپنے

۱۹۸۵ء ۔ ۔ ۔ میں اس کتاب کو ترتیب دیتے ہوئے ۱۸' ۱۹ اگست کی رات مجھے سپنا آیا کہ کچھ لوگ ایک قبر کھود رہے ہیں' اور میں چیخ کر کہتی ہوں۔ ۔ ۔ سارا ابھی زندہ ہے ' تم لوگ اس زندہ لڑکی کو دفن کر دینا چاہتے ہو؟

اپنی ہی چیخ سے میری آنکھ کھل گئی تو لگا۔ ۔ ۔ ۔ ایک طرح سے یہ سپنا سچا ہے۔ سارا کو پاگل قرار دینے سے لے کر مرنے تک مجبور کر دینے والوں نے۔ ۔ ۔ اسے زندہ ہی تو دفن کیا ہے۔ ۔ ۔ ۔

پھر نہیں جانتی ۔ ۔ ۔ کب آنکھ لگ گئی تو دیکھا۔ ۔ ۔ سارا کو قبر میں اتارا جا رہا ہے' اور میں کہتی ہوں۔ ۔ ۔ ٹھہرو! پہلے قبر میں دودھ ڈالو سارا نے دودھ کی قسم کھائی تھی کہ وہ موت کی آخری دستک تک نظمیں لکھے گی۔اس کی قسم پوری ہوئی۔ اب اس کے ایک بچے کی طرح' اس کا دودھ بھی بے کفن رہ جائے گا۔ ۔ ۔ ۔ پہلے دودھ کو کفن دو!

میں جاگی ۔ ۔ ۔ تو مری ہوئی آنکھ سے ہی سارا کی قبر کو دیکھنے لگی' جو جانے کہاں ہے؟

دھوپ کا ٹکڑا

تین ستمبر کی دوپہر تھی اور میرے پاس بمبئی سے باسو بھٹا چاریہ آئے تھے وہ ایک مشہور فلم ز ماتا ہیں' لیکن ان کے اندر گہرے میں ایک شاعر ہے' جو کبھی کبھی اتنا اوپر اٹھ آتا ہے کہ باسو گھنٹوں شاعری میں ڈوب جاتے ہیں-----

وہ مجھے اور امروز کو اپنی نئی نظمیں سناتے رہے- کچھ تو انگریزی میں تھیں جو سیدھا پہونچ پائیں لیکن کچھ بنگلہ میں تھی جن کا سطر سطر ترجمہ کرتے ہوئے وہ گھنٹوں ایک ایسے عالم میں کھو گئے کہ وقت جیسے گھڑی سے نکل کر کمرے کے ایک کونے میں خاموش بیٹھ گیا ہو اور ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہا ہو-----

ان کی کسی نظم کا کوئی تار کبھی اچانک ان کی زندگی کے کسی بہت نازک پہلو کو چھو جاتا اور ابھی زندگی کے ایسے فلسفے کو' جس سے عام طور پر تہذیب کہی جانے والی چیز آنکھ چرا کر نکل جاتی ہے----

اچانک میرے منہ سے نکلا---- باسو! یہ سب جو ہو رہا ہے' انسان کبھی نہیں دیکھتا---کہ جھوٹ کا بیج بو کر وہ سچ کی فصل کیسے کاٹ پائے گا؟ تشدد کا بیج بو کر وہ امن کی ہریالی کیسے دیکھ پائے گا؟---- تو باسو کہنے لگے--- باپ رے باپ! ایک فلم دیکھی تھی' فرانس میں' ٹھیک اسی موضوع پر کہ حیوانیت کا شکار ہو کر جب کسی نے حیوانیت سے پناہ مانگ لی تو اپنے کو جیسے ہمیشہ کے لئے حیوانیت کے پاس گروی رکھ دیا-----

اور باسو اس فلم کا خاکہ بتانے لگے---- ایک بہت خوبصورت لڑکی ہے' اتنی کہ جیسے خوبصورتی اور پاکیزگی کے تصور سے تراشی ہو---- اچانک ایک حیوان جیسے انسان کے ہاتھ پڑ جاتی ہے' جو اس سے جبر زنا کرتا ہے' اور وہ ٹوٹی ہوئی لڑکی اپنی حفاظت کے لئے کتا فروش کے یہاں جاتی ہے اور ایک ایسا کتا خریدنا چاہتی ہے جو صحیح معنوں میں اتنا حیوان

ہو کہ بڑے سے بڑے وحشی انسان سے اس کی حفاظت کر سکے۔۔۔۔
کتا فروش ایسا کتا تلاش کرتا ہے اور وہ لڑکی اسے خرید لیتی ہے کتے کو روزانہ سکھلائی دی جاتی ہے۔۔۔۔ کسی اجنبی پر جھپٹنے کی اور کاٹ کھانے کی۔۔۔۔
اور آہستہ آہستہ کتے کو اس لڑکی سے اتنا لگاؤ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی جان پر کھیل کر بھی اس لڑکی کی حفاظت کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔۔۔۔
اور پھر۔۔۔۔ وقت آتا ہے' جب لڑکی کو کسی مرد سے محبت ہو جاتی ہے۔ اس کے تصور میں زندگی کا ایک ایسا منظر جھلملاتا ہے' جس سے وہ واقف نہیں تھی' اور پھر ایک طرف لڑکی اپنے محبوب سے ملنے کے لئے دیوانی ہے اور دوسری طرف اس کا کتا اس کی حفاظت کے لئے اس طرح آمادہ ہے کہ لڑکی کا محبوب لڑکی کے پاس آنے کی جرات نہیں کر سکتا۔۔۔۔
اب حیوانیت سے گھبرا کر حیوانیت سے پناہ لینے والی لڑکی کے پاس کوئی راستہ نہیں کہ وہ پھر سے انسانیت کی کسی راہ پر قدم رکھ سکے۔۔۔۔۔ اور اسے کتے کو ہی قبول کرنا پڑتا ہے۔۔۔۔ ہم جنس کی طرح۔۔۔۔
اس فلم کی کہانی ایک بھیانک حقیقت کی کھلی آنکھ سے دیکھ سکنے کی ایک جرات تھی۔۔۔ ایک پر تیک تھی۔ لیکن سماج اور سیاست سے لے کر ہر انسان کی زندگی میں کون سی جگہ بھی ہے' جہاں حیوانیت کا اندھیرا انسان کی تقدیر میں نہیں ہے۔۔۔۔"
اگر کچھ بدلتا ہے تو صرف اتنا کہ۔۔۔۔ ایک طرح کی حیوانیت سے گھبرا کر انسان دوسری طرح کی حیوانیت کی پناہ لیتا ہے۔ لیکن ایک اندھیرا ہے' جو مسلسل بنا رہتا ہے۔۔۔۔ ایک تشدد ہے جو مسلسل بنا رہتا ہے۔۔۔۔ ایک انتقام ہے جو مسلسل بنا رہتا ہے۔۔۔۔ اور انسان ایک بار جب خون میں اور آنسوؤں میں بھیگنے لگتا ہے تو بھیگتا چلا جاتا ہے۔۔۔۔

باسو کی آواز' سماج' سیاست اور ہر مذہب کی اندھیری داستان میں ایک کرن کی طرح اتر رہی تھی' جب میرے منہ سے نکلا۔۔۔۔ تاریخ کوئی بھی ہو' تہذیب کوئی بھی ہو' صرف کچھ ایک انسان ہوتے ہیں' جو حیوانیت سے گھبرا کر حیوانیت کی پناہ نہیں لیتے اور انسانیت کی دھوپ میں کھڑے ہو کر اندھیروں کی داستان کہہ سکتے ہیں' سن سکتے ہیں۔۔۔۔

ٹھیک یہی پل تھا' جب سارا شگفتہ کی ایک نظم کا ایک ٹکڑا ہوا میں تیرنے لگا۔ ۔ ۔
"میرے آنگن میں جتنی دھوپ تھی' میں نے تیرے کپڑے سکھا دیئے۔ ۔ ۔ ۔ "

۔ ۔ ۔ سنو باسو میں نے کہا اور سارا کی نظم پڑھی۔ ۔ ۔ ۔ نظم پڑھتے ہوئے آنکھ بھر آئی ۔ کہا ۔ ۔ ۔ ۔ کمبخت مر گئی۔ ۔ ۔ ۔

باسو کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ایک طنز کی طرح تڑش گئی ۔ کہنے لگے ۔ ۔ ۔ جو انسانیت کی دھوپ میں کسی کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے یا خون سے بھیگے ہوئے کپڑے سکھانے کی جرات کریگا' اسکو کیسے زندہ رہنے دیا جائے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور باسو ایک گہرا سانس لیکر کہنے لگے ۔ ۔ ۔ اس دھوپ کے ٹکڑے کو اٹھا کر چلنا ایک مصیبت کو اٹھا کر چلنا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور ہوا میں تیرتا ہوا سارا کی ایک اور نظم کا ایک ٹکڑا کہہ رہا تھا ۔ ۔ ۔ "آج ہواؤں کو دراصل پاگل کتے نے کاٹ لیا ہے ۔ ۔ ۔ "

اور سارا کی یہ تلخ بیانی ایک جائزہ لے رہی تھی ۔ ۔ ۔ اس پورے ماحول کا' جس میں پاگل کتوں کی کاٹی ہوئی پاگل ہوائیں دھوپ کے ٹکڑے کو بھی کاٹنے کو آتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ایک منت

منت ماننے کا اتہاس اتنا ہی قدیم ہے' جتنا انسان کا دکھ۔ دیوی دیوتاؤں کے مندر اور پیروں کے مزار بھی منت ماننے کا مرکز بنتے ہیں اور کئی طرح کے پیڑ اور چشمے بھی۔ لیکن جب کوئی کسی مندر میں ناریل یا پھول اربپت کرتا ہے' کسی مزار پر چادر چڑھاتا ہے کسی پیڑ پر کپڑے کا ٹکڑا باندھتا ہے' یا کسی چشمے میں کچھ سکے ڈالتا ہے' تو اسکی منت کوئی ذاتی مراد پانے کیلئے ہوتی ہے۔ لیکن منت کے اتہاس میں صرف سارا شگفتہ تھی' جس نے انسان کو انسان دیکھنے کی تمنا کی۔

اور اس تمنا میں نہ کوئی مذہب حائل ہو سکتا تھا' نہ کوئی سیاسی اختلاف ' اسلئے پوری دھرتی کے بازو پر اس نے منت کا سوا روپیہ باندھ دیا ---

" باندھ دیا ہے میں نے سوا روپیہ دھرتی کے بازو پر " اس نے کہا اور پھر ہنس دی'

"سجدہ دھرتی پر اور عنایت عرش پر؟"

" دھرتی کے ہاتھ سے انسان مراد پائے " --- اور دوسرے لفظوں میں ---

"انسان کے ہاتھ سے دھرتی مراد پائے" --- ایک ایسا نکتہ ہے' جہاں اتہاس کی دو مختلف لہریں ملتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک لہر کو ہم ٹیگی فلاسفی کا نام دے سکتے ہیں اور دوسری لہر کو --- مارکس واد۔

سارا کسی واد کی پکڑ میں نہیں تھی ' اس لئے "تو یہ نقاد بھائی کی" کہہ کر ہنس سکتی تھی اور ہنستے ہوئے کہہ سکتی تھی -----

--- دانتے اس وقت کہاں ہے ؟

وہ اپنے پس منظر میں
ایک کتا مسلسل بھونکنے کیلئے چھوڑ گیا ہے ----

اس کتے کی خصلت کیا ہے؟
ہڈی کی یاد میں بھونک رہا ہے ----
اور لکھتے لکھتے سیاہی میں ڈوب جانے والی سارا نے جب دیکھا ----
میرے لہو کے چھینٹے جو پڑے پتھر پر
تو نئے الزام تراشے گئے ----
تو اس نے ہر الزام تراش کر ہر سوال کے جواب میں ایک سوال رکھا، جو آج تک ہوا میں کھڑا ہے ----
پہلے یہ بتاؤ کہ جھنجھنے کی جنم تاریخ کیا ہے؟
اور کسی الزام تراش نے غور نہیں کیا ہو گا کہ سارا کے اس سوال میں پھر وہی نکتہ سامنے آتا ہے۔ جہاں اتہاس کی دو مختلف لہریں ملتی ہیں۔ ایک تھی فلاسفی کہ خدا نے کن فیکون، کہا اور ایک سے انیک ہو گیا۔ اور دوسرا مارکس واد، جس نے ایسے نظام کی تمنا کی، جہاں ہر بچے کو جھنجھنا مہیا ہو سکے ----- یعنی ایک ہنستا کھیلتا ایسا بچپن مہیا ہو سکے۔ -- جس میں جوانی کے ہر خواب کو حقیقت میں بدل سکنے کی آرزو کے بیج چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔

اس سے اگر کوئی رشتہ ٹوٹا
تو انسان اور خدا کا رشتہ ٹوٹا
سارا تو دعا تھی
اور دعا ہمیشہ سلامت رہتی ہے

سارا کا جنم دن

سارا نے مجھے ایک خط میں لکھا تھا --- "میں ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۴ میں، بروز منگل، گوجرانوالہ میں پیدا ہوئی تھی"---

تو میرے ذہن میں کتنی ہی چڑیاں چہچہانے لگیں-----

جب اس سے ملاقات ہوئی تھی، ۱۹۸۰ کے شروع میں، جنم دن کی بات چلی تو کہنے لگی --- "چڑیوں کا چہچہانا ہی میرا جنم دن ہے۔"

اور آج سارا کی یاد میں میرے گھر کے آنگن کی ایک دیوار پر امروز نے سفید لکڑی کے کتنے ہی چھوٹے چھوٹے گھونسلے بنائے ہوئے ہیں، جہاں روز صبح بوگن بیلیا کی ہری ٹہنیوں سے کھیلتی سفید لکڑی کے گھونسلوں میں تنکے اکٹھے کرتی، کتنی ہی چڑیاں چہچہاتی ہیں۔----

اور میں روز صبح کہتی ہوں --- دیکھو امروز! آج سارا کا جنم دن ہے----

سعید احمد سے ایک ملاقات

۲۱ ستمبر ۱۹۸۵ء کی صبح تھی، جب فون پر مجھے پتہ چلا کہ سارا کے ایک بڑے قریبی دوست سعید احمد کراچی سے دلی آئے ہیں۔

میں سعید کے نام سے ۷ جون ۱۹۸۴ء کے دن واقف ہوئی تھی۔ جب انہوں نے مجھے کراچی سے فون پر سارا کی موت کی خبر دی تھی ۔۔۔

سعید سارا کے کتنے قریبی دوست ہیں، اس کی خبر اس دن فون پر انکی کانپتی آواز بھی دے رہی تھی۔ اور پھر ایک ہفتہ بعد ڈاک سے ملا ان کا ایک خط بھی، اور ساتھ ہی سارا کے ایک خط کی کاپی، جو کبھی سارا نے ان کے نام لکھا تھا۔

بعد میں بھی سعید صاحب کے کراچی سے فون آتے رہے کہ "سارا اکادمی" بنائی جا رہی ہے، سارا کی ایک کتاب شائع ہو رہی ہے، سارا کے کمرے جو کاغذات ملے ہیں، انہیں ترتیب دے کر اکادمی میں رکھا جارہا ہے ۔۔۔

اور اس لئے اب قریب ایک مہینے پہلے میں نے سعید صاحب کو خط لکھا تھا کہ اگر مجھے سارا کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کچھ اور کاغذات مل جائیں تو میں سارا کی جو داستان لکھ رہی ہوں، اسے لکھنے میں مجھے مدد لے گی ۔۔۔

اور میرے خط کے جواب میں یہ ۲۱ ستمبر کا فون تھا کہ سعید احمد سارا کے کچھ کاغذات لے کر دلی آگئے ہیں ۔۔۔

فون کے بعد قریب گیارہ بجے دوپہر سعید احمد میرے پاس آئے اور سلام دعا کے بعد میری آنکھوں کی طرح سعید صاحب کی آنکھیں بھی زمین کی طرف اس طرح دیکھنے لگیں، جیسے سارا کے وجود کو تلاش کر رہی ہیں۔

کچھ دیر کے بعد انہوں نے اپنے بیگ سے دو گھڑیاں نکالیں اور کہا ------ ایک

سارا کی طرف سے آپ کے لئے امرتا جی' اور ایک یہ میری طرف سے امروز کے لئے --
اور انہوں نے کہا۔ ۱۹۸۴ء میں فروری ' مارچ میں ہم دونوں نے سوچا تھا' دلی آنے کا۔ تب سارا نے یہ تحفہ سوچا تھا۔ آپ کے لئے --- اسکی خواہش میرے پاس امانت میں پڑی ہوئی تھی---

میں نے گھڑی پکڑلی' سعید صاحب سے کچھ نہیں کہا لیکن خاموش آواز میں اپنے خاموش خدا سے کہا۔ تم مجھے یہ کیسا وقت دکھا رہے ہو' کیسی گھڑی ' جس میں سے وقت منفی ہو چکا ہے---

اس سال سارا اکادمی کی طرف سے سارا کی نظموں کا جو مجموعہ شائع کیا گیا ہے "آنکھیں" سعید صاحب اس کی ساٹھ کاپیاں لے کر آئے تھے۔ ہندوستان کے ادیبوں کے لئے لیکن سرحد پر کسٹم والوں نے اعتراض کیا تھا' اور صرف ۱۲ کاپیاں لانے دی تھیں --- سعید صاحب کو اس بات کی حسرت تھی کہ وہ اب زیادہ ادیبوں کو یہ تحفہ نہیں دے پائیں گے ۔ لیکن ساتھ ہی انہیں ایک تسکین تھی کہ سارا کے خطوں اور نظموں والے کاغذات پر کسٹم والوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔وہ کاغذات سلامت تھے' اور دوسرے دن قریب دس بجے انہوں نے سبھی کاغذات میرے سامنے رکھ دیے---

کوئی بھی کاغذات پڑھنے سے پہلے میں سارا کے لئے سعید کی محبت پڑھنا چاہتی تھی' اس لئے کئی گھنٹے تک ان سے باتیں کرتی رہی---

اور محسوس ہوا کہ جس طرح سارا کے بغیر میری گھڑی سے وقت منفی ہو چکا ہے اسی طرح سعید کی زندگی سے بھی وقت منفی ہو چکا ہے۔

پوچھا سعید صاحب! آپ ایک کارخانہ دار ہیں اور سارا ایک شاعرہ پھر آپ کی ملاقات کس زمیں پر ہوئی تھی۔

سعید کہنے لگے ۔ جس زمین پر ایک مریض دوسرے مریض سے ملتا ہے۔ ہر مرض کی علامتیں الگ الگ ہوتی ہیں' ہر مرض کی شناخت بھی الگ الگ ' لیکن درد کی شناخت ایک ہوتی ہے۔ میں ضیاء میموریل اسپتال میں کسی دوست کی بیمار پرسی کے لئے گیا وہاں وزیٹرز گیلری میں انتظار کرنا ہوتا ہے۔ وہیں بیٹھا ہوا تھا کہ دیکھا ۔ ایک لڑکی اپنے آس پاس سے بے نیاز وہاں بیٹھی ہے اور اپنی کسی فائل میں اتنی ڈوبی ہوئی ہے کہ سر اٹھا کر نہ کسی انسان

کی طرف دیکھتی ہے نہ وقت کی طرف ۔ ۔ ۔ بس لکھے جا رہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جانے کیا ۔

میں نے بی اے آنرز کیا ہوا ہے۔ کئی سال کالج کے ماحول میں رہا تھا اور اس جوانی کے مہکتے ہوئے ماحول میں بھی کسی حسینہ کے لئے میں نے کوئی کشش محسوس نہیں کی تھی' لیکن وہ اسپتال کا کلوفارمی ماحول تھا' جہاں میں نے ایک لڑکی کو دیکھا' تو دیکھتا ہی رہ گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

قریب ایک گھنٹہ سوچتا رہا کہ یہ کیسی لڑکی ہے' جو نظر بھر کر دیکھتی بھی نہیں' بات کیسے کرے گی؟

میں اس کے قریب سے کتنی بار گذرا' میرے پیروں کی آہٹ اس کے کانوں تک نہیں پہونچ رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر شاید میرے خیالوں کی آہٹ اس کے کانوں تک پہنچی اور اس نے ایک بار سر اٹھا کر میری طرف دیکھا' اور میں نے جلدی سے پوچھا۔ ۔ ۔ ۔ محترمہ ! آپ کیا لکھ رہی ہیں۔ ؟

لڑکی نے سرسری سا جواب دیا۔ ایک اخبار میں کام کرتی ہوں۔ ۔ ۔ ۔ گھر پر وقت نہیں ملا تھا کچھ لکھنے کا۔ ۔ ۔ ۔

اس کی ذات سے جانے میرا کیسا لگاؤ ہوگیا' میں نے اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔ ؟

اس نے کہا۔ ۔ ۔ ۔ میرا نام روبی ہے ۔ ۔ ۔ ۔

سعید کی بات سن کر میں نے کچھ حیرانی سے کہا ۔ ۔ ۔ ۔ روبی؟

سعید ہنس دیئے۔ کہنے لگے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہماری بھی دوستی جھوٹ کی بنیاد پر ہوئی تھی۔ اس نے اپنا صحیح نام مجھ سے چھپا لیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کسی اخبار کا نام بھی یونہی لے دیا تھا' وہ اخبار نویس نہیں تھی۔ ۔ ۔ ۔

پھر جب میں نے پوچھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہاں ہسپتال کیسے آئی ہیں ؟ تو اس کا جواب بھی اس نے غلط دیا میرے بھائی صاحب بیمار ہیں' انہیں کی مزاج پرسی کے لئے آئی ہوں۔

یہ بات مجھے قریب دو سال بعد پتہ چلی کہ اس کا کوئی بھائی صاحب اسپتال میں نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اپنے لئے ہی ڈاکٹر سے ملنے آئی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں نے بیچ میں ٹوک کر پوچھا۔ ۔ ۔ ۔ سعید! اس کا مطلب ہے کہ پہلی ملاقات کے بعد پھر دو سال آپ کی ملاقات نہیں ہوئی۔ ؟

سعید کہنے لگے - - - - - - ہاں' ٹھیک دو سال میں اسے جگہ جگہ تلاش کرتا رہا لیکن وہ کہیں نہیں ملی۔ پہلی ملاقات ۱۹۸۱ء میں ہوئی تھی۔ پھر دو سال میں سبھی اخباروں کے دفتروں کے چکر کاٹتا رہا اور بار بار اسپتال کے راستے سے بھی گذرتا رہا۔ - - - -

اور سعید اپنی پیشانی کو ہتھیلی سے پونچھتے ہوئے کہنے لگے۔ - - امرتا جی! میں اکثر اسپتال جاتا رہا' اس طرح جیسے کسی اور کی نہیں' اپنی ہی بیمار پرسی کے لئے جا رہا ہوں۔ - - - لگتا تھا' ۱۹۸۱ء کے اس اکتوبر مہینہ میں جب میں اس سے مل کر اسپتال سے باہر آرہا تھا تو میرا ہی ایک حصہ اسپتال میں رہ گیا تھا۔ - - - -

میں نے پوچھا۔ - - - - پہلی ملاقات میں کوئی ادبی بات ہوئی تھی ؟

سعید کہنے لگے۔ - - مجھے یہ علم نہیں تھا کہ وہ شاعرہ ہے لیکن اسے اخبار نویس سمجھ کر کوئی ادبی بات کرنی ہی مناسب لگی تھی۔ اس لئے میں کرشن چندر' بیدی' منٹو اور قاسمی کے افسانوں کی بات کرتا رہا۔

اسی دوران کہیں میرے منہ سے نکل گیا میں نے تمہاری صورت میں ہی منٹو کو پڑھا تھا۔ - - - لیکن اس بات پر وہ اتنی خفا ہوگئی تھی کہ میں نے جلدی سے کہا تھا۔ - - - صرف منٹو کو نہیں میں نے تمہاری صورت میں کرشن کو بھی پڑھا' بیدی اور قاسمی کو بھی۔ - - -

میرے لئے یہ بات محض لفاظی نہیں تھی' لیکن اس نے میری بات کو شاید لفاظی سمجھ لیا تھا۔ - - خیر - - - - میں نے اسے اپنا صحیح نام بتایا اور صحیح ٹیلیفون نمبر اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ مجھے فون کرے گی۔ - - - لیکن اس کا وعدہ اس کے نام روبی کی طرح جھوٹا تھا۔

؟ - - - - - پھر سارا عرف روبی کیسے ملی -

س - - - - دو سال کے بعد اسی اسپتال میں اسی جگہ پر بیٹھی ہوئی اور اسی طرح کچھ لکھ رہی تھی۔ - - - - ایک بار تو مجھے اپنے ہی ذہن پر شک ہوا کہ یہ ۱۹۸۳ء نہیں ہے' وہی ۱۹۸۱ء ہے' اور میں ابھی وہیں کھڑا ہوں۔ - - - -

؟ - - - - - اس نے دیکھا اور پہچانا۔

س - - - - - نہیں میں نے ہی یاد دلائی۔ اسے کچھ کچھ یاد آیا' جب میں نے منٹو' کرشن' بیدی اور قاسمی والی بات دہرائی۔ - - - لیکن اس دن غنیمت یہ ہوئی کہ میں نے اسے

اسپتال سے باہر جاکر چائے کافی پینے کے لئے کہا تو وہ مان گئی ہم نزدیک ہی ٹاپ ان ریستوران میں چلے گئے۔

وہیں میں نے اسے بتایا کہ میں کس طرح اخباروں کے دفتر تلاش کرتا رہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وہ خاموش بیٹھی رہی' تو میں نے کہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے غلط کہا تھا کہ میں نے تمہاری صورت میں منٹو کے افسانے پڑھے۔ ۔ ۔ ۔ تمہاری صورت میں کرشن بیدی اور قاسمی کے افسانے پڑھے۔ حقیقت یہ ہے کہ تم ایسا افسانہ ہو' جو میں نے کسی کتاب میں نہیں پڑھا۔

؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "سارا ایک افسانہ" کا راز اس دن آپ کو معلوم ہوگیا۔ ؟

س ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں' یونہی کہا تھا بلکہ وہ جب اٹھ کر غسل خانے کی طرف جانے لگی تو میز پر رکھی ہوئی اپنی فائل کی طرف اور میری طرف اس طرح دیکھا جیسے جائزہ لے رہی ہو کہ میں اس کی غیر حاضری میں اس کی فائل کھول کر دیکھوں گا یا نہیں ۔ ۔ ۔ ۔

غنیمت یہ ہوئی کہ اس دن اس نے وعدہ کیا کہ وہ مجھے فون کرے گی۔ لیکن پھر دو مہینے گذر گئے اس کا فون نہیں آیا۔ ۔ ۔ ۔

میں جتنی دیر کارخانے میں رہتا تھا میرے کان فون کی طرف لگے رہتے اور جب اٹھ کر کسی کام کے لئے باہر جاتا تھا تو اپنے ایک اعتباری ملازم کو فون کے نزدیک رکھتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور دو مہینے کے بعد فون آیا' ہماری ملاقات طے ہوئی۔

اس دن میں نے ایک ضروری مال ریلوے سے وصول کرنا تھا اس لئے اپنی کار چھوڑی اور اسکوٹر لے کر چل دیا کہ راستہ میں بہت بھیڑ ہوگی اور میں اسکوٹر پر جلدی پہونچ سکوں گا۔ لیکن میری کم بختی کہ ٹھیک پل پر پہونچ کر میرا اسکوٹر پنکچر ہوگیا وہاں نہ تو میں اسکوٹر چھوڑ سکتا تھا نہ کسی چیز پر رکھ کر لے جاسکتا تھا۔ ہمارے وہاں ایک سوزوکی پک اپ چلتا ہے وہ بھی نہیں ملا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے کسی طرح پل کو پار کیا اور اسکوٹر کو ایک پٹرول پمپ تک لے گیا لیکن اتنی دیر میں پورا ایک گھنٹہ گذر گیا۔ اور جب میں ملاقات کی جگہ پہونچا تو وہ وہاں نہیں تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بس یہی غنیمت ہوئی کہ دوسرے دن اس نے فون کیا اور میں نے تفصیل سے پورا واقعہ بیان کیا اور وہ اس دن دوپہر دو بجے اسپتال میں ایک ملاقات کے لئے رضا مند ہوگئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس دن بھی ہم اسپتال کے باہر ایک ریستوران میں چلے گئے لیکن اس نے کچھ کھایا

نہیں صرف سوپ کا ایک پیالہ لیا۔۔۔۔

؟۔۔۔۔۔۔ اس ملاقات میں بھی وہ سارا عرف روبی تھی ؟

س ۔۔۔۔۔۔ بالکل تھی لیکن اس نے مجھے اپنی ایک نظم ضرور سنائی ۔۔۔۔ رسیاں ۔۔۔ وہ نظم اتنی پختہ تھی کہ میں نے سمجھا۔۔۔۔ یہ کوئی جنونی لڑکی ہے جو کسی بڑے شاعر کی نظم اپنے نام سے سنا رہی ہے لیکن یہ بات میں نے ظاہر نہیں ہونے دی آئندہ ملاقات کے لئے پوچھا تو کہنے لگی ۔۔۔۔۔ آئندہ ملاقات کا حق تمہیں دیا۔۔۔۔

؟۔۔۔۔۔ آپ نے حق تو دے دیا لیکن اسے استعمال کیسے کرنا تھا؟ آپ نہ اس کے نام سے واقف تھے نہ گھر کے ٹھکانے سے۔

س ۔۔۔۔۔۔ یہی تو میری مجبوری تھی فون کرنے کا حق اسے تھا۔ اگر وہ فون کرتی تو میں ملاقات طے کرنے والے حق کا استعمال کر سکتا تھا' ورنہ نہیں۔

خیر پندرہ روز کی غیر حاضری کے بعد اس کا فون آیا لیکن اس وقت میں کارخانے میں نہیں تھا میرا چھوٹا بھائی تھا جس نے فون سنا۔ اس نے جب مجھے بتایا کہ ایک لڑکی کا فون تھا اور ساتھ ہی حیرت سے پوچھا۔ بھائی صاحب یہ کون لڑکی تھی ؟ تو امرتا جی ! سچ مانئے گا اس دن میں نے زندگی کا پہلا جھوٹ بولا۔۔۔ کہا۔۔۔ یہ کوئی ٹیلی فون آپریٹر ہے' میری ایک کال نہیں مل رہی اسی لئے فون آیا ہوگا۔۔۔۔

اور پھر اس بات سے چھوٹا سا ہنگامہ ہوگیا۔ شام کو پھر اس کا فون آیا تو اس وقت بھی میری بھائی نے فون اٹھایا اور اسے کہنے لگا ۔۔۔۔۔ محترمہ ! ہماری اور کالز بھی نہیں مل رہی ہیں کب ملیں گی ؟

اور ادھر سے سارا پریشان کہ کون سی کالز ؟ خیر تیسرے فون کے وقت میں وہاں تھا اور ساری بات تفصیل سے بتائی جواب میں اس نے مجھے اپنے گھر کا پتہ بتادیا۔۔۔۔۔

؟۔۔۔۔۔۔ یہ اس کا پہلا اعتبار تھا آپ پر۔۔۔۔

س ۔۔۔۔۔۔ ہاں لیکن پورا نہیں ٹھیک پانچ بجے' جیسا اس نے کہا تھا میں اس کے گھر گیا۔۔۔ وہ ایک تین منزلہ مکان تھا جو در اصل اس کی بہن کا تھا جس کی ایک منزل میں ایک چھوٹا سا حصہ تھا' جہاں وہ ان دنوں ٹھہری ہوئی تھی۔ لیکن یہ بات اس نے مجھے نہیں بتائی اور کہا بھائیوں سے کچھ ناراضگی ہو گئی تھی' اس لئے میں نے یہ چھوٹا سا کمرہ کرایہ پر لیا ہے اکیلی رہنے کے لئے۔ لیکن مکان مالکن بہت اچھی ہے کئی بار مجھے چائے

کافی بھی دے دیتی ہے۔۔۔۔

اس نے مجھے ابھی تک اس حقیقت سے بھی واقف نہیں کیا تھا کہ وہ ایک شاعرہ ہے۔ کمرے میں کتابیں تو ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں لیکن چارپائی پر بیشمار کاغذ بالکل بے ترتیبی سے رکھے ہوئے اور فرش پر سگریٹوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔۔۔۔

چارپائی کی طرف دیکھ کر اس نے کہا اخباری معاملہ ہے بس اور کچھ نہیں۔۔۔۔۔ لیکن اس نے مجھے دو تین نظمیں سنائیں میں نے پھر یہی سمجھا کہ وہ شعر و شاعری کی دیوانی لڑکی ہے یونہی کسی کی نظمیں سناتی رہتی ہے۔

لیکن امرتا جی! پھر اس نے ایک نظم اور سنائی۔۔۔۔ "ڈھونڈ قبر دا کیویں چکاں"۔۔۔ آپ کو تو معلوم ہے وہ اردو میں بھی نظم کہتی تھی، پنجابی میں بھی۔۔۔۔۔ وہ نظم پنجابی میں تھی، احساس کی بڑی شدت سے لکھی ہوئی اور ساتھ ہی اس کے منہ سے نکلا "یہ نظم میں نے اپنی ماں کی موت پر لکھی ہے۔" تب مجھے شبہ ہوا کہ وہ خود نظم کہتی ہے۔

لیکن میں نے کہا۔۔۔۔۔ تم جو کچھ ہو مجھے منظور! میں تم سے کبھی کچھ نہیں پوچھوں گا۔ جب تمہارے دل میں آئے۔ مجھے کچھ بتانا چاہو تو سنوں گا۔۔۔۔۔۔ پوچھوں گا کچھ نہیں۔۔۔۔"

اس دن وہ ایک بار کمرے سے اٹھ کر غسل خانے میں گئی تو وہاں اس کے گرنے کی آواز آئی۔ میں نے جا کر اسے اٹھایا کمرے میں لا کر چارپائی پر ڈالا تو دیکھا کہ غسل خانے میں اسے خون کی الٹی آئی تھی۔۔۔۔

اب وقت میں نے اسے اتنا بھر بتایا کہ اس کے اندر السر ہے۔۔۔۔ اس کے بعد ہماری ملاقات ہر تیسرے روز ہوتی رہی۔

؟۔۔۔۔۔۔ اس نے اپنی زندگی کے کسی نامراد واقعہ کی بات نہیں کی؟

س۔۔۔۔۔۔ نہیں ایک بار صرف اتنا کہا کہ "نوائے وقت" کا ادبی صفحہ پڑھا کریں۔ اس دوران اس نے مجھے اپنا صحیح نام ضرور بتا دیا تھا پھر ایک دن نوائے وقت کا ایک شمارہ مجھے دیکر کہنے لگی گھر جا کر پڑھ لینا۔

وہ ایک تنقیدی مضمون تھا قمر جمیل کا لکھا ہوا، جس میں سارا شگفتہ کی نظموں کی بھی تعریف تھی افضال احمد سعید اور نسرین انجم بھٹی کی نظموں کی بھی لیکن مجھے اس تنقید پر شکوہ ہوا کہ سارا کی کسی نظم کا حوالہ نہیں دیا گیا تھا، جب کہ اور شاعروں کی نظموں کے

حوالے تھے۔

دوسرے روز جب سارا سے ملاقات ہوئی تو میں نے یہ بات کہی۔ ساتھ ہی کہا ---
افضال احمد کی ایک نظم کا ٹکڑا مجھے بہت اچھا لگا۔

ایک شاعر کا دل ایک شکاری کتا ہوتا ہے
اور عام آدمی کا دل ایک عام کتا---

اس وقت وہ ہنس دی اور کہنے لگی---- میں نے ہی اسے کتا کہا تھا۔ اس نے میرے کہے ہوئے لفظ پر نظم لکھ دی ---- یہ بات مجھے بہت بعد میں پتہ چلی کہ سارا نے جس کے ساتھ تیسرا نکاح کیا تھا وہ یہی شاعر تھا--- افضال احمد سعید----

؟----- آپ کبھی ذاتی طور پر افضال صاحب سے ملے ہیں۔

س---- جی ہاں! افضال سے بھی ملاقات ہوئی اور سارا کے دوسرے شوہر جاوید سے بھی۔ وہ دونوں اعلیٰ پائے کے شاعر ہیں۔ مجھے وہ ذہین اور اچھے لگے۔ سارا کے خاندان والے تو یہ بھی مانتے ہیں کہ سارا نے سکون کے جو کچھ دن گذر کئے تھے وہ دوسرے نکاح کے وقت تھے جب جاوید احمد سارا کا شوہر تھا۔

؟----- سارا نے مجھے خود لکھا تھا کہ وہ طلاق ایک غلط فہمی میں ہوا تھا۔ جس کے لئے اس کے شوہر کو واقعی افسوس تھا---

س------ پر اب اس کا تیسرا شوہر افضال' سارا کی کتاب کی رونمائی کے وقت آیا تھا خاموش اور اداس بیٹھا رہا----

؟----- سارا سے آپ کی ملاقات مسلسل ہوتی رہیں لیکن کون سی حسرت تھی جو آپ کے دل میں بار بار آتی رہی----

س----- صرف ایک ہی حسرت تھی کہ میں اس کی حفاظت کرسکوں۔ وہ اپنے منہ سے کبھی کچھ نہیں بتاتی تھی' لیکن ایک بار اس کے ہاتھوں پر کچھ نشان دیکھ کر پوچھا - یہ کاہے کے نشان ہیں ---- کہنے لگی--- اسپتال میں ڈاکٹروں نے ہاتھوں کی نسوں میں جو انجکشن لگائے تھے ان کے نشان ابھی باقی ہیں۔

میں نے پھر پوچھا ---- یہ انجکشن کیوں لگائے تھے ؟ تو وہ بڑی سرسری آواز میں کہنے لگی--- مجھے ہوش میں لانے کے لئے۔ میں نے خودکشی کرلی تھی اور گھر کے لوگ مجھے اسپتال میں لے گئے تھے----

امرتا جی ! میں سکتے میں آگیا اس کی بات سن کر پوچھا ---- خود کشی کیوں کرنے لگی تھیں ؟ تو اسی سرسری آواز میں بولی ---- یونہی زمین کا موسم بدلنے کے لئے ---- اور پھر ہنس کر سنانے لگی ---- وہاں اسپتال میں کوئی میری وہ کتاب لے آیا جو ہندوستان میں امرتا نے شائع کی ہے ڈاکٹروں نے بھی دیکھی اور مجھے کہنے لگے دیکھو تمہاری کتاب شائع ہوئی ہے۔ تمہیں خوش ہونا چاہئے۔ تم یہ بار بار خود کشی کیوں کرتی ہو ؟

اس دن امرتا جی مجھے معلوم ہوا کہ وہ زندگی میں چار بار کوشش کر چکی تھی ---- مرنے کی لیکن اس دن مجھ سے اس نے وعدہ کیا کہ اب زندہ رہوں گی ----

؟ ----- یہ وعدہ اس نے مجھ سے بھی کیا تھا۔ ---

س ----- میں نے اس سے ایک ہی چیز مانگی تھی کہ مجھے یہ حق دے دو کہ میں تمہاری حفاظت کرسکوں ---- اور جواب میں اس نے کہا تھا --- اچھا ---- آج میں نے تجرپیاس کا پیالہ توڑ دیا ----

وہ بے انتہاء خوش رہنے لگی تھی اس نے مجھے یہ بھی کہا کہ سعید ! اب میں تیری دوستی کا ذکر تفصیل سے امرتا کو لکھوں گی کہ اب میری آنکھوں پر گلابی رنگ رہنے لگا ہے ----

؟ ----- لگتا ہے ' مجھے کتنے ہی خط نہیں مل پائے ----

س ----- اب جتنے بھی کاغذات مل پائے ہیں وہ میں لے آیا ہوں۔ اس میں کتنے ہی خط ہیں آپ کے نام یا تو اس نے لکھے لیکن ڈاک میں نہیں ڈالے تھے یا ان کی کاپی رکھی ہوئی تھی ----

؟ ------ سعید ! ایک بہت نازک سوال پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ اس کی حفاظت کرنا چاہتے تھے لیکن کیا آپ کے معاشرہ میں بغیر کسی رسم یا رشتے کے لئے یہ ممکن تھا ؟

س ------ اس مسئلہ پر ہم نے کئی بار سوچا تھا۔ وہ کہتی تھی سعید ! کیا میں اور تم امرتا اور امروز کی طرح نہیں جی سکتے ؟

میں اس کے لئے کچھ بھی کرسکتا تھا لیکن اسے ہی کچھ منظور نہیں تھا۔ میں شادی شدہ ہوں اور اس کا اعتراض تھا کہ جس بات پر وہ ہمیشہ اپنے باپ کی مخالفت کرتی رہی کہ اس نے شادی شدہ ہو کر اور نکاح کیوں کیا تھا' وہی بات مجھے کیسے کرنے دے گی۔----

آپ کو ایک بات بتاؤں --- ایک بار اس نے میرے سے کچھ پیسے لئے اپنی کتاب

شائع کروانے کے لئے' لیکن جسے دینے تھے وہ اس دن نہیں ملا تو اس نے ڈھیر سے روپیوں سے ڈھیر سے کھلونے خرید لئے ---- میرے بچوں کے لئے ----

؟------ آپ چار اور پانچ جون کی بدنصیب رات کو کہاں تھے۔

س ------ میں نے ۲۸ مئی کو کسی ضروری کام سے کوئٹہ جانا تھا۔ سارا نے ضد کی کہ میں ساتھ چلوں گی۔ میں کسی بات پر اسے انکار نہیں کر سکتا تھا' اس لئے دو ٹکٹ منگوائے اور وہ میرے ساتھ گئی۔ ہم لوگ وہاں ۳۱ مئی تک رہے۔ میں نے اسے سے آگے گلستان جانا تھا اس لئے وہ وہیں رک گئی کوئٹہ میں' وہاں اس کا بڑا بیٹا کالج میں پڑھتا ہے۔ --- واپسی پر تین جون کی تاریخ پکی تھی کراچی میں ملنے کی۔ لیکن وہ تین تاریخ کی جگہ چار تاریخ کی شام کو کراچی پہنچی' اور ابھی ہماری ملاقات نہیں ہوئی تھی ---- جب چار تاریخ کی رات اس نے خود کشی کر لی ----

سنا ہے ---- ریلوے لائن پر سے ملے اس کے بٹوے میں دو خط تھے ایک اس کی بہن کے نام تھا اور ایک میرے نام' لیکن وہ خط مجھے ابھی بھی نہیں مل سکا ----

؟----- اور اس نے جو خط اپنی زندگی میں آپ کو لکھے' وہ میں دیکھ سکتی ہوں؟

س ------ وہ سبھی خط میں آپ کے لئے لایا ہوں۔ ایک بات اور کہ کراچی میں میں نے ایک اور مکان خریدا تھا لیکن ابھی خالی تھا۔ جب ایک بار سارا وہاں گئی اور اس کی ایک دیوار پر اس نے لکھ دیا ---- دل دا بھانوڑ توں اے' تے تیرا بالن میں ہاں۔

سعید کی آواز پگھل کر اتنی پانی ہوگئی کہ ان کی آنکھوں میں بھر آئی ---- مجھے لگا --- سارا جانے کیسا ایندھن ڈال گئی ہے اب سعید کی روح میں ایک آگ بنا ایندھن کے جلتی رہے گی۔

سلاخیں

۱۹۸۵ء کے پانچ اکتوبر کی دوپہر تھی' سارا لفظ لفظ میرے قریب تھی' جب امروز دوپہر کی ڈاک لائے اور انہوں نے سبھی چٹھیاں اور ڈاک میں جتنے بھی رسالے تھے انہیں کاغذوں کے قریب رکھ دیا جو سارا کی نظموں اور خطوں کو ترتیب سے رکھنے کے لئے میں نے اپنے سامنے اور ارد گرد بچھا رکھے تھے۔

میں ابھی ڈاک سے آئی چٹھیوں کو پڑھنا نہیں چاہتی تھی' اس لئے انہیں ہاتھ سے ایک طرف کر رہی تھی۔ ۔ ۔ جب ایک رسالے پر میری نظر پڑی' اور لگا کہ اس نام کا رسالہ پہلی بار دیکھ رہی ہوں' نام تھا ۔۔۔ انڈیکس آن سنسرشپ۔ ۔ ۔

اس کے پہلے ورق پر نوال السعداوی کا نام دیکھا' تو رسالہ ہاتھ میں لے لیا۔ اندر نوال کی تصویر تھی اور ساتھ ہی یہ ذکر کہ اس کی کتاب ابھی ابھی کویتہ میں شائع ہوئی ہے' "عورتوں کی جیل۔"

اس مصری ادیبہ نوال سے میری ملاقات ۱۹۷۵ء میں ہوئی تھی' اور وہ جتنے دن ہندوستان میں رہی ' اس دوران کتنی ہی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان ملاقاتوں کے دوران جو گفتگو ہوتی رہی' اسے میں نے لکھا بھی تھا اور شائع بھی کیا تھا۔

اس وقت نوال کے مجھے وہی الفاظ یاد آئے' جو انہوں نے ۱۹۷۵ء میں کہے تھے۔۔۔۔

"ہمارے مصر میں تین بہت بڑے ٹیبو ہیں ۔ ۔ ۔ ایک سیکس' دوسرا مذہب اور تیسرا سیاست۔ میں ان کی رجڈ نی کو توڑنے کے لئے اکثر انکی بات کرتی ہوں' اسی لئے ریڈیو اور ٹیلیویژن پر میں کچھ کہہ سکوں' اس پر پابندی ہے' اور اس لئے میری کتابیں مصر میں شائع نہیں ہوتی' لبنان میں ہوتی ہیں ۔ ۔ ۔"

میں اتنا جانتی تھی کہ نوال نے سائیکو سوشل اسٹڈیز پر کتنی ہی کتابیں لکھی ہیں' اور

سیکس ایجوکیشن پر کوئی سیمینار چاہے واشنگٹن میں ہو یا تاشقند میں وہاں ---- نوال کو دعوت نامہ ضرور ملتا ہے ---

اب ------ جو رسالہ ہاتھ میں لیا' انڈیکس آن سنسرشپ' یہ اگست ۱۹۸۵ء کا شمارہ تھا' اور لکھا تھا کہ ------ ستمبر ۱۹۸۱ء کا دن تھا' جب نوال کو حراست میں لے لیا گیا' اور ۲۸ نومبر تک جیل میں رکھا گیا اور ساتھ ہی انکی جو کتاب ابھی ابھی کوئٹہ میں شائع ہوئی ہے' عورتوں کی جیل' اس کتاب سے قریب چھ صفحے اس رسالہ میں شامل تھے ---

میں تڑپ کر کتنی ہی دیر نوال کی اس تصویر کو دیکھتی رہی' جس پر نوال کی آنکھوں میں ایک ایسا درد بھر ہوا دکھائی دے رہا تھا' جو انہوں نے اس زمین پر' صرف اپنے پر نہیں' ہزاروں لوگوں پر گذرتے دیکھا ---

میں نوال کے قلم سے لکھی ہوئی تفصیل پڑھ رہی تھی --- "میں ۱۹۷۲ سے جگہ جگہ گھوم رہی ہوں --- ایک ایسی زمین کی تلاش میں 'جو میرا وطن ہو سکے ---

آئین شیمز یونورسٹی کی میڈ-سن فیکلیٹی میں میں نے ایک تقریری دی تھی ۱۹۷۲ء میں' جس میں ہمارے معاشرہ میں عورت کی جو حالت ہے اس پر کڑی نکتہ چینی تھی'

اور ساتھ ہی میڈ-سن' لٹریچر اور پالیٹکس پر- اس سے اس پر' اسٹیٹ سیکورٹی کے چیف نے مجھ سے جواب طلب کیا- ڈاکٹروں کی یونین بھی ناراض ہوگئی' پبلشنگ ہاؤسز بھی اور میرا نام بلیک لسٹڈ کر دیا گیا- حکومت کی مشینری اگر کسی ادیب سے خفا ہو جائے تو اس ادیب کی آواز اس کے حلق سے باہر نہیں آسکتی ---"

اور اس تقریر کے قریب دس سال بعد' ایک دن نوال کی اسی تقریر کے الزام میں جس طرح اچانک حراست میں لے لیا گیااور جس طرح جیل کی سلاخیں ان کے گرد لپٹ گئیں --- یہی تفصیل پڑھتے میرے سامنے کبھی نوال کا اور کبھی سارا کا وجود آنے لگا ---

سارا کے ایک خط سے میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ اسے بیس دن حراست میں رکھا گیا تھا- سارا نے کبھی ان دنوں کی تفصیل نہیں لکھی- اور اب نوال کی قلم سے میں تفصیل پڑھ رہی تھی' لگا --- ٹھیک یہی تفصیل تھی' جو سارا نے کاغذ پر نہیں اپنے بدن پر لکھی تھی---

نوال جب لکھتی ہے --- " اب میرا نام کھو گیا تھا- اب میرا نام ایک نمبر بن گیا تھا- ۱۵۳۶" تو مجھے گورکی بھی یاد آتا ہے' ٹھیک انہیں الفاظ میں " اب میرا نام کھو گیا تھا'

اب میرا نام ایک نمبر بن گیا تھا ۔ ۔ ۔ ۶۸۹-۹"

میں نہیں جانتی ۔ ۔ ۔ جب سارا کا نام ایک نمبر بن گیا تھا' تو وہ کیا نمبر تھا' لیکن میں ان بے چارے نمبروں کی تقدیر پر رو دیتی ہوں' جو شاعروں اور ادیبوں پر لاگو کئے جاتے ہیں۔

سارا کا چلہ

سارا نے مجھے لکھا تھا ـــ "اپنے ہاتھوں سے لکھے ہوئے جو الفاظ ابھی تک مٹھی بھر کاغذوں کی صورت میں میری چھاتی میں دفن تھے' یہ چھاتی کی قبر سے نکال کر تمہاری اور اپنی گیلی آنکھوں میں رکھ رہی ہوں ـــ

اب سارا کی گیلی آنکھیں جس سورج نے سکھا دی ہیں ' وہ سورج ابھی مجھ سے ایک ہاتھ کی دوری پر ہے' اس لئے میری آنکھیں ابھی گیلی ہیں ـــ

سارا کے جو الفاظ میری گیلی آنکھوں میں بھرے ہوئے تھے' انہیں الفاظ میں آج اضافہ ہو گیا ہے' جب میں سعید احمد کے لائے ہوئے ان کاغذات کو دیکھ رہی ہوں جن میں کچھ ایسے خط بھی مجھے ملے ہیں ' جو سارا نے میرے نام لکھے تھے' اور مجھ تک پہونچے نہیں تھے۔

انہیں خطوں میں ایک خط ہے ـ ١٧ مئی ١٩٨١ء کا لکھا ہوا' جب سارا لیاقت اسپتال میں تھی ـــ

کم بخت لکھتی ہے'ـــ انسانوں کا چلہ کاٹتے کاٹتے جشن بھول گئی ہوں۔" دیوی دیوتاؤں کے اور پیروں فقیروں کے نام پر چلہ کاٹنے والوں کی ایک بہت لمبی تاریخ ہے' لیکن یہ سارا تھی' صرف سارا ' جس نے انسانوں کے نام پر چلہ کاٹا ـــ

ابھی مجھے اسپین کے مصور سالوڈور ڈالی کے الفاظ یاد آئے ہیں۔"مجھے سب کچھ یاد ہے ـ اس وقت سے لے کر جب میں اپنی ماں کی کوکھ میں تھا۔ آپ پوچھیں گے ـ وہاں کیسا لگا؟ وہاں کیا تھا ؟ " ـــ میں جواب دے سکتا ہوں ـــ " وہ بہشت تھا۔ آپ پوچھیں گے ـــ کیسا بہشت؟ "ـــ تو میں باریک بینی سے بتا سکتا ہوں ـــ " اس بہشت کا رنگ دوزخ جیسا تھا ـــ لال سگترہ کے رنگ جیسا' اور زرد بھی ـــ نیلا بھی۔

--- اور آگ کی لپٹوں جیسا بھی --- اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ جگہ بہت نرم تھی، پسلویں، گرم اور چھپاتی ہوئی بھی ---"

اور ڈالی کہتا ہے --- "یہ سب میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اپنی زندگی کے سبھی راز جتنے بھی ہو سکیں، میں انہیں قتل کردوں، اپنے ہاتھوں سے قتل کر دوں"

پوری تاریخ سامنے ہے کہ انسان اپنی زندگی کے راز سمجھنے کے لئے اور پھر کہہ پانے کے لئے---- اتنی تکلیف کرتا ہے کہ ان کتابوں کو ترتیب سے رکھے، تو وہ پوری زمین کو ڈھانپ دیں --- اور ایک سارا تھی --- جو ایک فقرہ میں کہہ پائی ------ "راز تو انسان کی تھوک سے بھی چھوٹا ہوتا ہے، خوامخواہ انسان کو لئے پھرتا ہے ---

سارا کا خط ------ ہے

لیاقت اسپتال ۸۱-۵-۱۷

امرتا پریتم!

آگ جینے لگی ہے تو میں مرنے لگی ہوں۔ موت تلوے چاٹنے لگے، تو لمحوں میں بہتے انسان کم ہونے لگتے ہیں، میرے تینوں طرف اس وقت تم ہو۔ شاید یہ سچ نہیں اس وقت بہت سے چہرے ہیں۔ دیواروں پر بوڑھے ہونے والے لوگ جل رہے ہیں۔ میں قدم قدم چوری ہو رہی ہوں۔

انسان ہے کہ دکھوں کا نوالہ کھائے چلا جاتا ہے۔ انسانوں کا چلہ کاٹتے کاٹتے جتن بھول گئی ہوں۔ اپنے ارد گرد میں ہوں۔ بس، میں کیسا سناٹا ہے!

چراغ کی زبان ہماری رات بنتی جارہی ہے۔ اور انسان ہاتھوں سے ہٹ جائے تو آنکھ بھی ہٹ جاتی ہے۔ جب بھی چلنے کی کوشش کرتی ہوں، کفن چور کی بھوک کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔

جانے یہ کون سی دنیا ہے۔ یہاں آنکھوں کے زہر سے بڑھ کر کوئی زہر نہیں۔ پچھلے دنوں ایک موت کا انتقال ہوا۔ مرنے سے پہلے ہی وہ موت پر رہتی تھی۔ سوچتی ہوں۔ پہلے اس کا نام لکھوں یا راز لکھوں۔

خیر ---- راز تو انسان کی بھوک سے بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ خوامخواہ انسان کو لئے پھرتا ہے۔ سوال ایک کرتی ہوں۔ اعضا زیادہ بولنے لگتے ہیں۔ وہ ایک بانجھ آنکھوں والی۔ میرے جنم کے تو بچے غافل کر دیئے۔ مجھے تو چھاؤں کی نظر لگ گئی ہے اب میں تمہیں

باغوں میں نظر نہیں آؤنگی کہ خدا کی آنکھ میں بے شمار سوال تھے اور میں نے ترازو کو خاموش کر رکھا تھا کہ رہوں تو میں اپنے رہوں ---۔ کیوں خاک پر قدم سا سوال رکھوں !

دیواریں قدم رکھنے لگی ہیں ۔ اب بھول چوک ہی ہمارا گھر ہو گئے۔

امرتا وہ بالوں سے شروع ہوتی تھی اور زمین پر ختم ہوتی تھی۔

ہاں ----- وہ روٹھے روٹھے ہاتھ مجھ سے ملاتی تھی۔ کیا بے زبان تھی۔ اس کے آنسوؤں میں بہہ جاتی تھی۔ کیا وہ اتنی رب تھی' یا مجھے قحط پڑا ہوا ہے وہ ہونٹوں سے گرتی تو میں آنکھوں سے اٹھا لیتی۔ وہ آنکھیں اٹھا کے بھاگ نکلی۔ میں قدموں کا جوا کھیلتی رہی اور وہ کفن پہ آنکھیں رچائے ایک قدم کا اعلان کر رہی ہے۔ کیا خیال ہے! اس کے ہاتھوں کے ساتھ میرا لمس قبری نہیں ہوا۔

دن رات پہ چھلانگ لگاتا ہے۔ رات دن پر چھلانگ لگاتی ہے۔ ذلیل شام کی سیٹی بجا گئی اور ہمیں چوکیداری میں چھوڑ گئی۔

یہ اسپتال ہے۔ یہاں بھوک ہائے ہائے کرتی ہے۔ سامنے کی چادر پر ایک عورت چادر جتنی خاموش پڑی ہے اس کے ماتھے پر میری تلک لگی ہے کہ میں اپنے رنگ چھوڑ رہی ہوں۔

اس کے ہاتھ پھیکے پڑ رہے ہیں اور آواز دے رہے ہیں۔ آواز کون دے رہا ہے؟ وہ بالوں سے شروع ہونے والی عورت نہیں' عورت چادر سے تھک گئی ہے۔ اور حیا کے پنجرے سے کبوتر اڑ رہے ہیں۔

عورت کی ہر پور میں مرد ہوتا ہے۔ پھر وہ کیسے اشارہ ہوئی یہ انسانوں کی بکرا پیڑھی ہے۔ یہاں کوئی نہیں کہے گا کہ اللہ کے نام پر ختم کرتا ہوں۔

رات کی تسلی ہے' اور صبح بجھی ہے۔

ذائقہ تو مجھے چکھنے لگا ہے' کینچلی ہی نہیں بدل پا رہی -----

سرخ گرد۔ سیاہ گرد

ہماری زمین سے دو طرح کی گرد اٹھتی ہے۔ ایک سرخ رنگ کی اور ایک سیاہ رنگ کی۔

سرخ رنگ کی گرد وہ ہوتی ہے جسے شہرت کہتے ہیں اور سیاہ رنگ کی گرد وہ جسے الزام کہتے ہیں۔

جس کے بدن پر یہ گرد لپٹتی ہے' اگر سیاہ رنگ کی ہو تو لوگ اپنا بدن چرا کر چلتے ہیں اور سرخ رنگ کی ہو تو لوگ اسے کمخواب کی طرح پہن کر چلتے ہیں ----

لیکن دنیا میں تھوڑے سے لوگ ہوتے ہیں ---- جو اس گرد کو چاہے وہ سیاہ ہو یا سرخ اپنی آتما کے پانی سے اپنے بدن پر سے دھو سکتے ہیں۔----

اور سارا دنیا کے ان تھوڑے سے لوگوں میں سے تھی ----

اور سارا کے کچھ وہ خط دے رہی ہوں جو سارا نے مجھے لکھے لیکن مجھ تک پہونچے نہیں تھے۔ اب سعید احمد صاحب جو کاغذات لائے ہیں انھیں سے میں یہ خط حاصل کر سکی ہوں ----

امرتا جی!

جی چاہتا ہے ----- موت کا گھونگھٹ اپنے ہاتھوں سے اٹھا دوں اور آنکھوں کی کچہری سے دور نکل جاؤں -

کاش! میری مٹی روٹھ جائے۔

سنسان آنکھوں میں کون رہنے کو آئے گا۔ آنکھوں کی سیاہی سے بندوں کو لکھ رہی ہوں۔----

کاش! میری مٹی روٹھ جائے۔

سنسان آنکھوں میں کون رہنے کو آئے گا آنکھوں کی سیاہی سے بندوں کو لکھ رہی ہوں----

میں تو ایسی سبیل ہوں جہاں لوگ کبھی کبھی چندہ دینے آجاتے ہیں---- امرتا! امی کی شدید خواہش تھی کہ میں اپنے کفن کو اپنے لہو کے سرخ رنگ سے رنگ دوں۔

میری آنکھیں ایک بار پھر رنگ دی گئی ہیں۔ تیری سارا پھر حیا سے روند دی گئی ہے۔ پچھلے دنوں جب میری آنکھیں زخمی ہوئیں تو پتہ چلا کہ یہ تیر میری ماں کی دعاؤں سے نکلا تھا۔ پچھلے دنوں میرا نکاح اس وقت ہوا امرتا' جب میں حواس میں نہیں تھی۔ ہوش آیا تو پتہ چلا ---- میں ایک آدمی کی پراپرٹی ہوچکی ہوں ---- دیکھا ---- ایک جاہل دیہاتی جس کی زبان کلہاڑی سے زیادہ تیز اور کوئی ڈیڑھ فٹ چادر اس کا قدر ہوگا۔ زبان اس کی ہروقت زہر تھوکتی رہتی ہے۔ میں ہروقت اپنے دل کو دفن کرتی رہتی ہوں۔

پندرہ روز ہوئے ہیں مجھے ایمنٹ بدلے۔ صرف ایک بات سے خوشی تھی کہ چلو کم از کم دوا تو وقت پر مل جایا کرے گی۔ گھر والے بھی میرا علاج کروا کروا کے تھک چکے تھے اور چاہتے تھے کہ یہ روگ اب کسی اور زمین کو لگ جائے۔

امرتا! شوہر صاحب روز زنا بالجبر کے بعد سوجاتے ہیں۔ سونے سے پہلے ان کے حکم کے مطابق مجھے ان کی ٹانگیں روز دبانا ہوتی ہیں اور سر پہ تیل کی مالش بھی ضروری ہوتی ہے۔

ایک ماہ ہو چلا ہے میری شادی کو۔ میں نے گھر سے ایک قدم باہر نہیں نکالا ایک روز میں نے پاؤں نہیں دبائے تو کہنے لگے ---- تم تو بڑی گھٹیا عورت ہو اور تم اچھی عورت نہیں ہو۔ اس طرح کی بے شمار باتیں ----

اور لکھنے بیٹھتی ہوں تو کہتے ہیں ---- لکھنا اتنا ضروری نہیں ہے۔ پہلے میری ٹانگیں دباؤ' اور ہروقت لکھنے پڑھنے کی وجہ سے تم مجھ پر رعب ڈالنا چاہتی ہو کہ تم ملک کی مایہ ناز شاعرہ ہو اور میں ایک جاہل دیہاتی آدمی ہوں۔ تمہارا لکھنا اتنا ضروری نہیں ہے جتنا ضروری ہے میرے پاؤں دابنا ---

میں نے بہت کوشش کی کہ اس شخص کو سنوار دوں لیکن کھائیاں کبھی سدھری ہیں؟

اس خط کا پہلا حصہ شروع دسمبر میں لکھا ہوا لگتا ہے اور دوسرا حصہ بہ حساب پندرہ دن بعد سارا کا یہ نکاح ۱۷ نومبر ۱۹۸۲ء کو ہوا تھا۔

امرتا ! آنسو تو دل کی دھڑکن میں چبھ سے رہے ہیں اور آنکھیں ہیں کہ کربلا کا میدان ہوئی جاتی ہیں ------

آج امی نے کہا ---- تم جو مرد کو برا بھلا کہتی ہو اس لئے سب سے پیچھے ہو۔ عورت کبھی مرد کا مقابلہ نہیں کر سکتی ۔ تجھے میرے سفید بالوں کا بھی خیال نہیں اپنا گھر بساؤ۔

میں نے امی سے کہا ۔ ماں میں تیرے رحم میں تو مر سکتی ہوں' تیرے دل میں دھڑک نہیں سکتی۔ مٹی تم بھی ہو مٹی میں بھی ہوں میں انسان کو جنم دیتی ہوں۔ اس لئے غلامی کا پیشہ میرا مذہب نہیں۔ میرا نام تو کوئل ہے جو اپنے موسم کے ساتھ روتی ہے کوکتی رہتی ہے ------

پھر امرتا میں آنسوؤں کی کوکھ تک روتی رہی۔ ---- ماں نے اس سے پہلے کبھی اتنے سخت الفاظ نہیں کہے تھے امرتا !

گھر کیا بساؤں ! اب تو میرا گھر قلم ہے ----
میں روز ویرانوں میں دھنستی چلی جا رہی ہوں !
میرے لہو سے تو مہندی کی بو آتی ہے ۔
جس طرح پھولوں سے سورج کا رشتہ نہیں ٹوٹ سکتا ----

بیماری کی وجہ سے کتاب ابھی تک نہیں چھپ پائی۔ باقی کام تو مکمل ہے۔ صرف پریس جانا باقی ہے طبیعت ٹھیک رہی تو ضرور ہندوستان آؤں گی۔ ----

لوگ میرے ناخن سے بھی چھوٹے ہیں امرتا! میں کسی سے باتیں کیا کروں۔ مطلب پرستی' خود غرضی کے علاوہ ان کے پاس کوئی پھول نہیں -----

میں نے تو لوگوں کو اپنے لہو سے سینچا ہے لیکن رو لٹ جاتی ہوں۔ یہ میں کہاں ہوں امرتا! آج کل تو اکیلے باہر نہیں جا سکتی۔ راستے بھول جاتی ہوں۔ بس بن شاخوں کے آگ لگ گئی ہے۔

کاش ! میرے لہو میں کوئی آواز نہ کھلے ۔
چھاؤں کا درد پیڑوں میں رہ گیا ہے۔
میں مٹتی جا رہی ہوں۔ کاش کوئی مجھے لکھ دے ---- میں پاگل ہونا نہیں چاہتی ۔
کوئی ہے جو میرے موسم سے!کوئی ہے' جو میرے دل کے اندھیروں پر زبان رکھ دے ۔

پانیوں پر میرے قدم کی مہر ثبت ہے اور روانی میری روح ہے۔
میں ایڑی سے لے کر آنکھ تک پہونچی ہوں مگر بہت پیاسی ہوں ۔
تنہائی مجھے تاریک کر رہی ہے۔
وقت کا سانپ مٹی پہ لہرایا ہے' اور زخموں کی کوئی موت نہیں ہوتی ۔

۲۸ ۔ ۳ ۔ ۸۳

امرتا!

مجھے صدیوں سے ایک آنسو کی تلاش ہے لیکن اگر بہت رویا تو میں کنکروں سے بھر جاؤں گی ۔

ہر در مجھے سولی کی طرف لے جاتا ہے حالانکہ میرے گھر میں اتنا اندھیرا نہیں ہے --

اصل میں میں اپنا انتظار کر رہی ہوں' اور جب کشکول اپنی سیاہ قید سے آزاد ہوگا' انسان کو کالی موت سے نہیں ڈھانپا جائے گا۔ کہتے ہیں دنیا ایک قید خانہ ہے اور تم ایک سلاخ۔ پھر باقی اندھیروں کا کیا ہوگا۔ ---- ان اندھیروں کو کون سے دلوں میں دھڑکنا ہوگا ؟

میرا قدم جو چاپ دہراتا رہتا ہے' میں اسے جاننا چاہتی ہوں' میں اپنا انتظار کر رہی ہوں ایک ایک لمس سے زنجیر کی صدا آتی ہے میں اپنی آواز ڈھونڈنا چاہتی ہوں' جو بے جان سکوں میں کہیں کھو گئی ہے اور ساری زنجیر کھول دو گے تو تمہارے پاس ایک کڑی بھی نہ جائے گی۔

تعلق کی زبان صرف چہرے پر سجی نہیں رہ سکتی۔ پھٹے کپڑے میں تم بدن کی سرگوشیاں تو سن سکتے ہو' لیکن میں نے اپنی روح کے ساتھ میں ایک کشکول رکھا ہوا ہے اور صدیوں سے تم سے ایک انسان مانگ رہی ہوں ۔

چھاؤں کے اندھیروں میں اپنی پناہ نہیں ڈھونڈتی' تم مجھے پناہ کی گالی مت دو۔ نہیں تو ٹھہرنے والی آوازیں مجھے قید کرلیں گی ۔

اصل میں میں اپنا انتظار کر رہی ہوں لیکن ابھی زمین شروع ہونے میں کافی وقت ہے ----

تمہاری ۔ سارا شگفتہ

۲۸ - ۳ - ۸۳

امرتا!

زمین رہنے کے لئے تھوڑی اور دوڑنے کے لئے بڑی ہوتی ہے۔ ابھی امی کو روح ہوئے چند روز ہی ہوئے تھے' سارا خاندان اکٹھا تھا۔ میری بہنیں میرے بھائی موت کی طرح سیاہ ہو رہے تھے۔ کانوں کی میت بھری چٹائی کے تکتے کچھ یوں چیخے - - - - - تمہاری وجہ سے سارا' تمہاری وجہ سے ہماری امی کا انتقال ہوا - - - - -

امی! ابھی چٹائی پر موجود تھیں کہ نہلانے والی نے کہا - - - - اس کے بچے اس کے کان میں تین بار اپنا درود بخشوائیں۔ خیر تمام بہن بھائیوں نے باری باری درود بخشوایا۔

جب امی حیات تھیں تو میں نے کمرے کی ایک دیوار پر لکھا تھا۔ کانٹے پر کوئی موسم نہیں آتا۔ امی اکثر لڑا کرتیں اور کہتیں ' یہ دیوار سے مٹا دو' کانٹے پر موسم آتا ہے۔

خیر میں بھی ظاہراً" امی کے کان میں درود بخشوا رہی تھی۔ لیکن میں نے امی کے کان میں یہ کہا - - - - "امی تم ٹھیک کہتی تھیں' کانٹے پر موسم آتا ہے۔" امی چپ ڈولی میں بدا ہوئیں - - - - سارا خاندان میرے گرد - - - - "ہم تمہیں ان اینٹوں سے رہا کرتے ہیں - - - تم نے لکھ لکھ کر پورے خاندان کی مٹی پلید کر رکھی ہے۔ اخباروں کی سرخیاں ہمارا لگان لگاتی ہیں۔ ہمارے دشمن ہمارے شریک اخبارات لئے پھرتے ہیں تم نے امی کے عشق کا واقعہ کیوں لکھا - ؟

وہ تمہارے والد سے پنگھٹ پر ملا کرتی تھیں۔ اب تو اسے بخش دو - "

میں سوچنے لگی میری ماں تو ایک عظیم عورت تھی کہ اس نے اپنے خاندان کو خیرباد کہا اور میرے والد سے چھپ کر شادی کرلی۔ اس دور میں تو یہ بات اور مشکل رہی ہوگی - - - -

خیر امرتا! مجھے اس گھر سے نکال دیا گیا اور کہہ دیا گیا کوئی ادیب ' شاعر اخباری نمائندہ ہمارے گھر نہ آئے اور ہم تمہیں عاق کرتے ہیں -

میں مسکرائی اور پوچھا - کس ہتھیلی سے - ؟

"تم رات گئے گھر واپس کیوں آتی ہو؟ "

میں نے کہا - "بھائی' علم گھونگھٹ میں رکھا ہوا چہرہ تو نہیں۔ مجھے پڑھنے لکھنے کے لئے مزدوری کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا کرو گے زیادہ سے زیادہ روٹی سے محروم کردو گے -

----- بھوکی مادھن روٹیاں لگاتی ہیں اور دیکھتی ہے ابھی کتنے گھروں کا آٹا رہ گیا ہے۔
بھائی میں کاغذوں پر اپنے پھن لکھتی رہوں گی ------ پھر میں نے سوال کیا۔ کیا
میں امی کے چالیسویں تک رہ سکتی ہوں۔"

تم اسی وقت یہاں سے چلی جاؤ۔"

میں نے اپنی کتابیں اٹھائیں اور سڑک پر چلنے لگی آوازوں کا ایک قافلہ میرے ساتھ
چل رہا تھا-----

۱۔ اس کا کیا ہے یہ تو کہیں بھی سو سکتی ہے----

۲۔ اچھا ہے' پاگلوں کی طرح سڑکوں پر پھرے----

۳۔ ایسا نہ کریں اسے پاگل خانے میں داخل کروا دیا جائے۔

۴۔ باتیں سن کر مجھے ویسے ہی خون کی الٹیاں آنے لگی تھیں یہ اخباروں کی سرخیاں
تھیں۔

امرتا!

۵۔ کیا یہ لوگ' اجلے لوگ یہ بات بھی بھول گئے تھے کہ بعض اوقات میں بالکل
ہوش میں نہیں ہوتی۔ --- بلکہ کئی بار خود مجھے پاگل خانے میں داخل کروا کر آتے
رہے۔ ایسا نہ ہو کہ سینکڑوں اور مردوں کا دکھ میرے بدن میں اتر آئے----

شاعر و نثی حضرات کے گھر جاتی ہوں تو ایک سرخی اخبار میں لگی ہوگی کہ سارا نے
فلاں رات فلاں شاعر کے ساتھ گذاری-----

لوگ اکیلی عورت سے کتنا ڈرتے ہیں۔

میں اپنی ایک دوست کے یہاں چلی گئی اس نے گھر کی ایک چابی مجھے دے دی اور کہا
---۔ "تم یہاں رہو" میں رہنے لگی۔ چند روز بعد میں نے اپنی دوست سے کہا۔---
"مجھے یہ قالین اچھے نہیں لگتے۔ تمہاری گاڑی کا ہارن جب بھونکتا ہے تو مجھے بڑی گھٹن
محسوس ہوتی ہے۔ دوست' تم تحریک نسواں چلاتی ہو۔ تمہیں بڑی بڑی ایڈ ملتی ہے' اور تم
ان پیسوں سے شراب پی جاتی ہو۔ تمہارا گناہ بھی کورا ہے۔ گناہ کا بھی ایک مذہب ہوتا
ہے---- تمہاری ہنسی مصنوعی ہے اور میری یہ زیبائش نہیں۔ یہ لو چابی' میں جا رہی
ہوں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ کسی فقیر کے ساتھ رات گذار لوں۔----

میں اپنی ایک بہت ہی اچھی دوست رضیہ کی جھونپڑی میں رہنے کے لئے چلی گئی۔ اس

نے میرا بہت خیال رکھا۔ آدھی آدھی روٹی ہم دونوں کھا لیا کرتے تھے۔ خیراتی اسپتال سے دوا لے آیا کرتے تھے۔

اسی گھر کا واقعہ ہے۔ - - - اچانک گلی میں شور اٹھا۔ دیکھا' باہر بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔

"آپ نے جوان عورت کو گھر میں رکھا ہوا ہے جی؟"

"ویسے ہی یہ کوئی شریف عورت نہیں لگتی۔ اس کا لباس جھونپڑیوں والا نہیں ہے۔ اسے یہاں سے نکالیں۔ جانے کہاں سے بھاگ کر آئی ہے۔"

میں نے جھونپڑی کو بڑے غور سے دیکھا اور کہا - - - - "اے جھونپڑی' تیرے پاس بھی تنکوں کا موسم نہیں ہے۔ اور اے جھونپڑی! تو مجھ سے شاید اس لئے خفا ہے کہ جب میں تیرے پاس آئی تھی' میرے پاس ایک تنکا بھی نہیں تھا۔ - - - "

پھر ایک نشست میں ایک شاعر نے کہا' "سارا صاحبہ' خبر پڑھی تھی کہ آپ کے گھر والوں نے آپ کو عاق کردیا ہے۔ آپ میرے گھر رہئے۔"

پھر امرتا! میں ایک روز بیمار ہوگئی۔ ہسپتال والوں نے مجھے داخل کرلیا۔

بھائی منظور کو پتہ چلا تو پھر مجھے ایک زمین کے ٹکڑے پر واپس لے آئے۔

کراچی

امرتا! میری امرتا! تم مجھے بہت یاد آتی ہو اور اس کا بہت بہت شکریہ کہ تم نے میری کتاب چھاپ دی۔ میری طبیعت ذرا سنبھل جائے' میں انشاء اللہ اگلے ماہ تک تمہارے پاس ہوں گی۔ اپنی امرتا کے پاس۔ قمر جمیل بھائی بھی آپ کو سلام کہہ رہے ہیں۔

تم پریشان نہ ہونا' میں اب بالکل خیریت سے ہوں۔ بڑے بھائی سعودی عرب سے ایک ہزار روپے سالانہ بھیجتے ہیں' دوا کی پریشانی نہیں ہے۔ امروز کو سلام' بچوں کو پیار۔

تمہاری اپنی سارا

۲۴ - ۴ - ۸۳

امرتا!

یہ بھی سچ ہے' میری بیوقوفیوں کی وجہ سے بھائی بہن' شاعر' ادیب' عزت دار سوسائٹی

مجھے بڑی نفرت سے دیکھتی ہے۔ ایسا کیوں ہے امرتا؟

کہیں لوگ سچ تو نہیں بول رہے اور میں اپنی چھوٹی چوریوں کی بدولت' اپنی رنگ سازی میں مصروف ہوں۔

چند روز پہلے بہت اچھے اچھے لوگوں نے مجھے ملنے سے انکار کردیا۔ ---- "سارا صاحبہ آپ ہمارے گھر مت آیا کریں۔"

سیڑھیوں سے کیا اتری' میں تو اپنے چہرہ سے اتر گئی۔ میں نے سارا سے کہا' ضمیر کے نمک سے آٹا گوندھتی ہے۔ ضرور تیرے لباس میں ایسا رنگ ہے جو تجھے نظر نہیں آتا۔ اب جاؤ کہ پڑھے لکھے لوگوں کے گھروں میں اب میرا کوئی کوڑھ نہیں۔ ضمیر اور آنکھوں میں کچھ فاصلہ رہ گیا ہے' امرتا! جبھی تو لوگ میری گری ہوئی آنکھیں مجھے تھماتے رہتے ہیں۔ زرد لہو میں زرد پتوں کی چیخیں آتی ہیں' تو خزاں سے آنکھیں مرنے لگتی ہیں امرتا!

سچائیوں کے نمک مجھے مردہ قرار دیتے ہیں----

اپنی وحشتوں میں کہیں سے بھی رات گئے آرہی ہوں' تو بھائی کی آنکھیں زانی کیوں ہوجاتی ہیں امرتا!

میرا بدن حیرت بھری گٹھڑی بن جاتا ہے۔

میں لیروں لیر ہوجاتی ہوں------

لباس کی سلامتی کیا مجھ سے ضروری ہے؟

بھائی بہن مجھے دیکھتے ہیں' تو ان کی آنکھیں دکان سے زیادہ نہیں کھلتیں۔ یہ لس کے کون سے پٹ ہیں امرتا؟

میں صرف گھونگھٹ بھری یا چادر بھری عورت تو نہیں' اور بھی افکار ہیں میرے پاس۔ کئی دراڑیں ہیں میرے لہو میں۔ رات ایک کنجری کی طرح مجھ پر اترتی ہے' اور میرے شفاف کلیجے سے سنگریزے گرنے لگتے ہیں۔ بتوں کی تراش خراش آخر میرے ہی ذمہ کیوں؟

شعوری گھروں والے اپنی آنکھوں کے چھینٹوں پر میرے کنول رکھتے ہیں۔ کتنے گندے لوگ ہیں۔ میری جھنکار ایک قیدی کی گود میں ڈالتے رہتے ہیں-----

تھینکر سوسائٹی تو اپنے گناہوں کا نام سارا بتاتی ہے۔ گھر والے بھی کچھ فاصلے سے نہیں رہتے۔

خاندانی چادریں آخر انسان سے چھوٹی ہوتی ہیں۔

میں لہو کا کوئی کلیم ماننے پر تیار نہیں۔

بہنیں اپنے گھونگھٹ میں زخمی زبان رکھے جانے کیا کیا چراتی رہتی ہیں۔

میں ان کے آنکنوں کا کچرا ہوں تو لگا کیوں نہیں دیتیں آگ! لہو کی لگام سے آخر ہر وقت میرے لئے کیوں پھندا بنا جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہ کون سی کڑیاں ہیں جو میری زنجیروں میں بجی ہیں؟

میں ان چھ بتوں سے کم از کم ایک بت ہوں۔

آخر میری بھی کوئی مٹی ہے!

تم بھی سوچتی ہوگی۔ ۔ ۔ ایک ہی رنگ ساز سے اپنے دوپٹے رنگاتی رہتی ہے۔ کیا کروں، میری صدی کا رنگ ہی ایسا ہے۔

تھوڑی دیر پہلے بھائی نے پوچھا، "کہاں سے آرہی ہو؟" میں نے کہا، وہاں سے جہاں سے تم سننا بھی گوارا نہیں کرو گے۔"

ایک بہن گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ بہنوئی نے کہا "جہاں سارا شگفتہ ہوگی، وہاں ہم لوگ نہیں رہ سکتے ۔ یہ غیر مردوں سے ملاقات کرتی ہے۔" اور میں سوچنے لگی، کاش کوئی مرد غیر ہی ہوتا۔

خیر، اہل محلہ کی بھی کوئی اچھی دریافت نہیں ہوں میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہ بھی سچ ہے، میں غریبوں کا جنابھر آتا ہوں۔ باقی تو شریفوں کا کنستر ہے، جہاں چیونٹیوں کی قطار بھی بھوکی رہ جاتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

امی کے انتقال کے بعد سے میرے قدم زنابالجبر ہو کے رہ گئے ہیں۔

لہو کے کوئیں میں صدا لگاتی ہوں تو آوارہ لوٹ آتی ہے۔ لیکن نہ کبھی میں نے اپنی آواز کو جھاڑا ہے، نہ کبھی اپنے لباس کو پھاڑا ہے۔

آخر زندہ گرد زندہ انسانوں پر ہی تو رہتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ خیر، پتیاں پھول سے بچھڑ کر میری گرد کا اعلان کرتی رہتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

امرتا! میں ہاتھوں میں لگی آگ بجھا رہی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ تم بہت یاد آتی ہو۔ بہت جلدی ہندوستان آؤں گی۔

امروز کو سلام، بچوں کو پیار!

تمہاری سارا

۸۳ - ۷ - ۷

امرتا!

آنکھیں دو جڑواں بہنیں ہیں۔ ایک تیرے گھر بیاہی گئی' دوسری میرے گھر۔ تمہاری زندہ آنکھوں کو سلام کرتی ہوں۔ دیکھ امرتا' میرا تو یہ حال ہے ----

میں نے سمندر کو رنگ چرایا تھا تو فرش بنایا تھا
آنکھوں کے رنگ چرائے تھے تو دیواریں بنائی تھیں
بھوک کا رنگ چرایا تھا تو چولہا بنایا تھا
چغلی کا رنگ چرایا تھا تو کپڑے سلوائے تھے
اور جب آگ کا رنگ چوری کیا تو میری روٹی کچی رہ گئی ---
سمندر جب پتھر کی سطح پر آتا ہے تو سفید ہو جاتا ہے۔
اور ہوا جب پیڑوں پر چڑھ ناچتی ہے تو ہری ہو جاتی ہے۔
اور آدمی جب روتا ہے ---- اپنے آنسوؤں میں ڈوب جاتا ہے۔
اس وقت تم آدمی کا کوئی رنگ چوری نہیں کر سکتے ----

امرتا!

چند روز پہلے مجھے احساس ہوا کہ میں تو دہلیز سے بھی زیادہ ڈرے قدم رکھنے لگی ہوں۔ چنانچہ کچھ نچے نقاد اور کچھ نچے قسم کے شاعروں کے یہاں پہنچی اور ان کے اصل میں اتری۔ انہیں تعلیم یافتہ گالیاں دیں پتہ چلا' صبر کی پٹاری میں سانپ کو بھوکا رکھنا زہر کو حاملہ کرنا ہوتا ہے۔

بہت دنوں سے سنتی آرہی تھی ------ جی سارا تو مجھ سے عشق کرتی ہے--- سارا تو آسان ہے ---- سارا تو میرے ساتھ سوچکی ہے ---- ارے بھائی' سارا کے ساتھ سوئے بھی ہو تو کون سا تم نے تیرا مارا ہے --- حالانکہ امرتا' میرے اس قسم کے تعلقات کسی کے ساتھ نہیں ہیں۔ اتنی کچی ضرور ہوں کہ بتا دیتی ہوں کہ بھائی' میری بندیا کی آگ کن چرنوں میں لگی ہے----

امرتا!

جب میں پانچویں کلاس میں پڑھتی تھی' میں نے ڈانس کے مقابلے میں حصہ لیا تھا وہاں ایک پنگھٹ بنایا گیا تھا۔ ایک رسی۔

گیت کے بول تھے ---- "پیاسے کو پانی پلائیو رے گوری تو راہی مسافر جائے"۔ --

لڑکی کہتی تھی "ہاں ' بھر پیو چھیلا! کاہے کو روگ لگائے۔"

میں پندرہ اسکولوں کے مقابلہ میں اول آئی تھی۔ پھر بھی اتنی خوشی نہیں ہوئی۔ آج کل جب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ طبیعت خراب ہونے والی ہے' کمرہ بند کرتی ہوں' میوزک لگاتی ہوں اور خوب ڈانس کرتی ہوں---- اور پھر اکثر سو جاتی ہوں۔

پچھلے دنوں ڈاکٹر نے امی سے کہا کہ اب کوئی دوا اثر نہیں کر رہی' اب مارفیا کا انجکشن لگا کرے گا---- میں نے انکار کر دیا۔ خود کوشش کر رہی ہوں کہ ٹھیک ہو جاؤں۔ کافی حد تک ٹھیک ہی ہوں۔

تمہاری سارا شگفتہ

پاگل خانہ

۱۹۸۲ء میں جب سارا نے مجھے اپنی زندگی کی داستان لکھ کر بھیجی تو پاگل خانے کے دنوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ۔ ۔ ۔ "بڑی مشکل سے میں نے کاغذ اور قلم حاصل کئے اور پاگلوں کی گفتگو لکھتی رہی جلد شائع کرواؤں گی"۔ ۔ ۔ وہی گفتگو اب مجھے ان کاغذات میں سے ملی ہے جو سعید احمد صاحب کراچی سے لائے ہیں۔

سارا کا یہ مضمون ایک دستاویز ہے' یہاں درج کر رہی ہوں :

پاگل خانہ

مجھے ہوش آیا تو میں کراچی ہسپتال' یعنی پاگل خانے میں تھی۔ میرے اردگرد پاگل عورتیں گھوم رہی تھیں۔ میں کونے میں دبک گئی اور سلاخوں کو دیکھنے لگی دروازہ پر تالے کی آنکھ لگی ہوئی تھی۔

یہ قید ایک نئے انداز سے میرے بستر پہ لیٹی تھی۔ مجھے اپنے تیسرے شوہر کے ظلم یاد آئے اور ایک نفرت' جو قید سے بڑی تھی ۔ ۔ ۔

میرا شوہر بے جا مجھے اتنا مارتا کہ جسم پر نیل پڑجاتے ۔ ۔ ۔ بے قصوری کی سزا جرم سے بڑی ہوتی ہے۔ وجہ یہ تھی' وہ میری شاعری سے ڈرا ہوا تھا اور احساس کمتری کی وجہ سے مجھ پر ظلم کرتا۔ حالانکہ میں اس کے بوٹ پالش کرتی۔ تمام گھر والوں کے کپڑے دھوتی' فاقہ برداشت کرتی' ساس نندوں کی گالیاں سنتی' مجھے پڑوس جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ہربات پر مجھے آوارہ کہا جاتا۔ حالانکہ میرے پاس چونی تک نہیں تھی۔ اس نے شادی کتے کی طرح لوٹ لوٹ کر کی تھی۔ شادی کے تیسرے روز وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدل گیا۔

میں چوڑی کی طرح ٹوٹ گئی اور چار دیواری کی پناہ میں وہ کچھ ہوا جو سڑکوں پر بھی

نہیں ہوتا۔ وہ جب چاہتا میرے جسم پر بھونکتا' میں خوف زدہ ہوجاتی پھر مجھے ایک ماہ میں دورے پڑنے لگے۔ میں طلاق مانگتی تو وہ مجھے اور مارتا۔ نندیں گالیاں دیتیں ۔ میرے پڑھنے سے اسے تکلیف ہوتی۔ میں دن بھر رویا کرتی میرے گھر والے بھی میرے گھر نہ آتے کہ میں نے پسند سے شادی کی تھی۔ کوئی پرسان حال نہ تھا۔

خیر' چھ ماہ کے جبر اور تشدد کے بعد میں نے طلاق لے لی۔ مجھے دوسری زندگی مل گئی' لیکن میں ذہنی توازن کھو بیٹھی۔ گلیوں میں گھومتی رہتی۔ غلط لفظ بولتی رہتی۔ اور پھر جو شاعر حضرات تھے انہوں نے میری دیوانگی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور مجھے اور ذلیل کیا۔ میں بالکل پاگل ہوگئی۔

میری امی مجھے پاگل خانے چھوڑ آئیں' علاج کے لئے۔ جب مجھے ہوش آیا۔ ۔ ۔ ۔ ایک عورت زنجیروں میں سہمی بیٹھی تھی۔ دوسری عورت نے خلاؤں سے آنکھیں باندھ رکھی تھیں۔ تیسری عورت کی گھڑی سے وقت گر گیا تھا۔ میں ان کو دیکھ کر بہت روئی۔ میں شاعرہ ہوں۔ میں نے انکی باتیں لکھنا شروع کردیں۔

ایک عورت مسلسل کہتی رہی ۔ ۔ ۔ میرا ازار بند مت کھولو۔ دوسری عورت ۔ ۔ ۔ میں گھر نہیں جانا چاہتی۔ کہیں ڈاکٹر میری چھٹی نہ کردے۔ میں یہیں رہنا چاہتی ہوں۔

ایک عورت جو پاگل نہیں تھی' اس کا بھانجا اسے پاگل خانے چھوڑ گیا تھا۔ وہ کہتی میں پاگل نہیں ہوں ' وہ میری جائیداد پر قبضہ کرنے کے لئے مجھے یہاں چھوڑ گیا ہے۔ وہ واقعی پاگل نہیں تھی۔

ایک عورت نے بتایا ۔ ۔ ۔ میرا شوہر دلا ہے اور مجھ سے پیشہ کرواتا ہے۔ میں شریف خاندان کی ہوں۔ ایک دوست پولس والے نے مجھے پکڑا' تصویریں اخباروں میں آئیں اور جب پولیس مجھے پکڑ کر لی گئی ' حوالات میں دس پولس والوں نے میرے ساتھ زنا کیا اور پھر مجھے مارا بھی' اس پر میں ذہنی توازن کھو بیٹھی ہوں۔

ایک اور بچی نے کہا میرا دیور اور میرا شوہر میرے ساتھ سوتے ہیں اور مجھے بلیک میل کرتے ہیں۔

ایک کنواری بچی نے کہا۔ ۔ ۔ محلے کے ایک غنڈے نے مجھے اغوا کیا اور رات بھر پانچ مرد مجھے لوٹتے رہے۔

اور پانچ عورتیں اس وجہ سے بیمار تھیں کہ ان کے شوہر محبت کرتے تھے' کماتے

نہیں تھے۔ وہ بچوں کو پالنے کے لئے جھاڑو برتن کرتی تھیں۔

ایک بہت پڑھی لکھی لڑکی بھی تھی۔ وہ اور میں زیادہ تر ساتھ رہتے میں پہروں اس سے باتیں کیا کرتی۔ ایک خاص وقت پر میوزک لگادیا جاتا۔ گانے کے بول تھے۔

"آج میں آزاد ہوں دنیا کے چمن میں"

میں اٹھی اور ناچنے لگی۔ پھر تمام عورتیں ناچنے لگیں، رقص ختم ہوا تو میری دوست رونے لگی۔ میں نے پوچھا کیوں رو رہی ہو؟

اس نے بتایا ۔۔۔ مجھے ایک سے محبت تھی۔ میں نے گھر چھوڑا، بچے چھوڑا اور میرے عاشق نے میری تصویریں اتاریں اور مجھ سے اسمگلنگ کروانے لگا، اور میں بلیک میل ہوگئی۔ اور پھر اس نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور پھر رقص کرنے لگی۔

ایک بڑی بی نے کہا۔۔۔ میرا بیٹا میرے ساتھ زبردستی سوگیا ۔۔۔ اور پھر ایک ۔۔۔ قہقہہ کا اضافہ ہوا۔۔

ڈاکٹر آتے اور ایک ایک منٹ گفتگو کرتے ۔۔۔ ایک منٹ کا مطلب ہے ۔۔۔ نوٹس ۔۔۔ علاج نہیں۔

پاگل کا علاج کیا ایسے کرتے ہیں؟

کوئی عورت شور مچاتی تو الیکٹرک شاک لگادیتے۔ ہم جنرل وارڈ کے پاگل خانے میں تھے، اس لئے ہماری کوئی چیز محفوظ نہ تھی۔ ایک عورت دوسری عورت کا پھل کھا جاتی۔ ایک عورت میرے سگریٹ پی گئی، ایک فروٹ کھاگئی، ایک نے کپڑے پہن لئے۔ آپس میں عورتیں اتنا لڑتیں کہ ایک دوسرے کے کپڑے پھاڑ ڈالتیں۔

میں چلاتی رہتی چائے دو، چائے دو۔ سگرٹ منگادو۔ کوئی نہ سنتا۔ وقت پر روٹی آتی، گندے برتنوں میں، کھرا اتنا گندا کہ میں اکثر ایک دو نوالہ ہی زہر مار کرتی،

ایک ڈاکٹر تو مجھ سے لڑ پڑا۔ مجھے دورہ پڑگیا۔ خیر، سسٹرس دلاسا دیتی رہیں۔ ڈاکٹر نہیں آیا۔ میں نے ہسپتال کی دیوار پر لکھا، نازی کیمپ، اور ڈاکٹر سے کہا ۔۔۔ "میں کالم لکھوں گی تمہارے خلاف۔"

وہ ہنسا "کالم تو کتنی بار لکھے جاچکے ہیں۔"

جب انصاف کے صدقے میری چھٹی ہوئی تو میں بہت روئی۔ میری عورتیں مجھ سے بچھڑ کر پھر پاگل خانے میں رہ گئی تھیں۔

سلاخوں سے تالا کھولا گیا۔ اور میں دروازے کے باہر۔ ساری عورتیں مجھے دیکھنے لگیں، جیسے کہہ رہی ہوں ---

"سارا، اب تو تم اصلی پاگل خانے میں جا رہی ہو۔"

کراچی ہسپتال سے لکھا ہوا --- سارا کا ایک خط -- اردو کے مشہور افسانہ نگار رام لال کے نام

رام لال!

آج میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ یہ عمارت پتھروں کے پیمان سے بنی ہے۔ وہ ہنسا۔ اس کی ہنسی میں ہزاروں آہیں تھیں، جو بے چارے ڈاکٹر کے بس میں نہیں تھیں۔

سفید چادروں پر آدھے زندہ آدھے مردہ لوگ۔ انسان کی زندگی چادر سے بھی تھوڑی ہے۔ جیوتش کی بھوک بانجھ ہوتا ہے رام لال۔

آج میں خدا سے زیادہ اداس ہوں کہ وارڈ میں دو عورتیں مر گئیں ہیں۔ جی چاہتا ہے --- میں بھی مٹی کی خاموشی چرالوں اور آنکھوں کے بین مرنے والیوں کی ہتھیلیوں پر رکھ دوں لیکن ان کے جسم اندھے ہو چکے ہیں۔ کل تک جو عورت اپنے والوں سے زیادہ باتیں کیا کرتی تھی، دیکھوں کتنی چپ ہے ---

چاندنی میں کوئی داغ نہیں ہوتا۔ خدا کا کانٹا کسی کے بھی حلق میں پھنس جاتا ہے۔ تو خیال گذرا --- سب سے بڑا شکاری ہے --- رب۔

پیاسی منڈیر کی رسی دراز تھی اور مجھے کنوارے خدا کی بددعا لگ گئی تھی۔

میرے لہو سے اداس آوازیں آتی ہیں۔ جوگن مردہ پیڑ کی لے پر ناچ رہی ہے۔ یہ دروازے ہیں کہ تابوت! ڈر میری انگلیاں کیوں کھولتا ہے۔ رات پرندوں کے پروں میں رہ جائے گی سورج روز انسانوں کی فصل کاٹ رہا ہے۔ رام لال! مجھے بھی موت قریب ہی لگ رہی ہے۔ خیر، دیکھا جائے گا۔ میں آپکا بہت احترام کرتی ہوں۔ اور لفظ لفظ رکھتی ہوں کہ صاحب! لفظوں کے سوا ہمارے پاس بچا کیا ہے جواب جلدی دیجئے گا۔

والسلام ----- سارا شگفتہ

سلیم احمد کے انتقال پر

نظم ہو یا نثر، قلم کی تخلیق کو ہمارے رشیوں نے اس حسینہ کا نام دیا تھا، جسکا دیدار صرف اسے نصیب ہوتا ہے، جس کے پاس روح کی آنکھ ہو ---

سارا کے پاس یہ آنکھ تھی، اور سارا کی یہی آنکھ رو دیتی تھی، جب چاروں طرف اسے لفظ فروش دکھائی دیتے تھے ---

کہتے ہیں --- سلیم احمد ایک بہت بڑے شاعر تھے، بہت اچھے نقاد اور بہت اعلیٰ انسان تھے اور کسی نے سلیم احمد کے لئے جب غیر شعوری لفظ استعمال کئے تو سارا سے رہا نہیں گیا۔ کہنے لگی ---" جمیل بھائی! نفرت سے بڑا رزق آپ نے نہیں چکھا، اور اسی لذت نے آپ کے اندر خوف کے گہرے کنویں کھود رکھے ہیں ---"

اب سارا اکادمی سے جب مجھے سارا کے لکھے ہوئے مضمون ملے ہیں تو ان میں ایک مضمون سلیم احمد کے انتقال پر لکھا ہوا بھی ملا ہے ۔وہ کس پہچان سے لکھا ہوا ہے، سارا کی اسی آنکھ کی بات کرنے کے لئے اس مضمون کا کچھ حصہ یہاں درج کر رہی ہوں۔

اس مضمون کو سارا نے نام دیا ہے--- "سلیم احمد اور سارا شگفتہ کی پاگل ڈائری"

علم کا سمندر مٹی نے اپنے من میں کہیں چھپا لیا ہے--- یہ کمی ہمیں سے ہمیں کو محروم رکھے گی ۔ ظرف اور ضبط کی زمین ہم سے بچھڑ گئی ہے۔

انسانیت ان کا مذہب ہے، اور یہی ان کا علم، اور یہی ان کا درس، انسان کھو جائے تو انسان کے لئے اس سے بڑی کوئی اذیت نہیں ہوتی۔ وہ زندگی کے بہت بڑے نقاد تھے، اور ہیں ۔ ان کی تجزیاتی اور علمی آنکھیں بڑی زندہ ہیں۔ ان کی تحریریں صدیوں سے مکالمہ معلوم ہوتی ہیں کسی سے مانگی ہوئی زمین نہیں۔

وہ اپنے یہاں لفظ کو سنگسار نہیں کرتے، بلکہ لفظ کا پورا اولیا جاننے کے بعد لفظوں کے

ہاتھوں کو زندہ کرتے ہیں۔ اور لفظ کو انسان کہتے ہیں۔

ادھوری ' کے دور سے جب یہ گزر تے ہیں تو تخلیقی عمل میں وہ جذبوں کی پرواز میں کہیں بھی ادھورے نہیں اترتے بلکہ اپنے یہاں کی تخلیق کو مکمل سوچ دیتے ہیں۔

جمالیاتی لہجہ میں وہ کہیں بھی بھٹکتے ہوئے نظر نہیں آتے خواہ جمالیات کو انہوں نے مدت کے لفظ سے ہی شروع کیا ہو۔

کبھی کبھی تو کہتے نظر آتے ہیں کہ چتا کے دھوئیں سے میں نے انسان بنایا۔ جذبوں کو وہ پیوندی نہیں کرتے ' بلکہ جذبوں کی قید سے کر تخلیق کرتے ہیں۔

تحریروں کی زباں درازی سچے وجدان رکھتی ہے۔ تصورات کی شکلیں نہیں کہتے' بلکہ روانی کو روح کہتے ہیں۔

ابلاغ کے فلسفہ کو انہوں نے اتنی جلا نہیں بخشی ہے کہ نیا لکھنے والا بھی چٹان کو لفظ کرتا آگے بڑھ جاتا ہے۔ آبشار کی طرح۔

سلیم احمد نے تمام عمر ادب کی بے لوث خدمت کی ہے۔ اس کے علاوہ نئی نسل کو جو شعور دیا ہے' اپنی تحریروں سے اپنی طرز زندگی سے ' اسے نئی نسل بھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔

انکا درس اور انسانی رویہ انسان تک پہونچا ہے۔ ان کے چلے جانے سے سارا شہر رویا ہے' جیسے ہر سنسان آدمی نے خود کو اپنے آنسوؤں میں ڈھونڈ لیا ہے۔

سلیم احمد نے مجھے اس وقت سے بیٹی جانا' جب میں لفظ لفظ بھی نہ تھی ---

میں جب کبھی سلیم احمد کے پاس جاتی' دو چراغ خاموشی سے انہیں دے دیتی۔ وہ مسکرا کر رکھ لیتے اور کہتے -- کیسی ہو سارا بیٹی!

شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا کرتے اور خاموش چراغوں کو دیکھا کرتے۔ جس روز سلیم احمد کا انتقال ہوا اس روز میں حسب دستور دو چراغ خریدنے کے لئے گئی۔ چراغوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ لیکن سارے چراغ کہیں نہ کہیں سے ٹوٹے ہوئے تھے ۔ میں نے چراغ والے سے کہا --- کیا کوئی چراغ سلامت نہیں ؟

اس نے کہا --- آج سارے چراغ ٹوٹ گئے ہیں میں نے کہا --- تو پھر آج مجھے ٹوٹے ہوئے چراغ ہی دے دو۔

میرے ہاتھ میں ٹوٹے ہوئے چراغ تھے ۔ اور میں سوچ رہی تھی' آج سلیم احمد کو

ٹوٹے ہوئے چراغ ہی دے دو گی مسکن عزیز پہونچی تو شامیانہ لگا ہوا تھا اور بے تحاشہ لوگ

میں کبھی کوئی تقریب ہے شاید۔ لیکن ابھی گیٹ تک ہی پہونچی تھی کہ فراست رضوی نے پہلے ٹوٹے ہوئے چراغ اپنے ہاتھ میں تھام لئے اور پھر کہا --- سلیم احمد تو -

--

اور میرے اندر وہ سارے چراغ جل بجھ کر شور مچانے لگے --- مجھے اذیت سے یہ احساس ہوا کہ اب مجھے بیٹی کہنے والا کوئی نہیں ---

سارا کا ایک خط
دوسرے شوہر کے نام

۱۲ جولائی ۱۹۸۲ء کا لکھا ہوا سارا کا ایک خط مجھے ملا ہے جو دوسرے شوہر کے نام لکھا ہوا ہے طلاق کے کئی برسوں کے بعد۔

خط سے لگتا ہے کہ وہ انسان بھی سارا کو کھو کر بہت اداس تھا۔ اتنا کہ جینا نہیں چاہتا تھا اور لگتا ہے کہ اس نے سارا کو ایک یا کئی خط لکھے تھے۔ لیکن سارا کے کاغذات سے سارا کے نام کسی کا لکھا ہوا کوئی خط مجھے نہیں ملا۔

اس ایک خط کی جو رف کاپی مجھے ملی ہے وہ اس داستان میں ضرور شامل کرنا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔کہ یہ ایک تاریخی حوالہ ہے۔۔۔کہ جس شوہر کے نام اس نے نظم لکھی تھی "تو بارات ہار گیا"۔۔۔۔اس کی اداسی دیکھ کر خط لکھا۔۔۔۔"وعدہ کریں کہ آپ بدن نہیں ہاریں گے"۔

خدایا! سارا کے اندر کا انسان کتنا بڑا تھا جو طلاق جیسے حادثہ پر پیر رکھ کر آگے بڑھتا ہوا کہہ سکتا تھا۔۔۔۔"دریا کا وعدہ تم کرو' پیاس کا وعدہ میں کرتی ہوں۔"

جاوید! ایک دن آگ کا سیلاب آیا اور سارے چراغ اپنے سنگ بہا لے گیا۔ آپ کہاں ہیں میں کہاں ہوں' مجھے بھی پتہ نہیں چلتا ایک پتھر کی سل دل کی جگہ دھڑک رہی ہے۔۔۔۔

ایک دن کالی آندھیاں میری آنکھیں اڑا لے گئیں۔ اب میرا اندھا بدن جانے کن کن ٹھوکروں میں ہے۔ جھونپڑی کی کوکھ بھی تنکا تنکا ہوئی۔ ہوا اتنی بانجھ تھی کہ میری گود پر ہاتھ تاپنے آئی لیکن آؤ! ہاں' آؤ! میں نہیں چاہتی تمہیں ٹھنڈ لگے اور میرا خدا سرد ہو جائے۔۔۔۔

کیا کروں! گھڑیوں کے سینے مجھے پکارتے ہیں۔ لیکن گھڑی تک پہونچتے پہونچتے وقت تبدیل ہوجاتا ہے۔ میں اپنے تاریک لہو میں جی رہی ہوں اور اس تاریکی میں جب کوئی قافلہ گذرتا ہے، تو اس کی گھنٹیوں کی آواز سے چنگاریاں اٹھتی ہیں اور میری تاریکیوں کو جلانے کی کوشش کرتی ہیں۔

میں اتنی خاموش ہوچکی ہوں کہ اپنی چادر سے روز مری ہوئی آوازیں چنتی رہتی ہوں مجھے وہ سولی یاد ہے جب میری آنکھیں جلاد کو سونپ دی گئی تھیں اور میرا سینہ وقت کی سلاخوں میں پرو دیا گیا تھا۔ - - -

حالانکہ میں نے سورج کو بڑی مشکل سے جنا تھا۔ آنکھوں کی سرانڈ سے بے ذائقہ ہوگئی۔

آپ اتنے پریشان نہ ہوں۔ ابھی تو سانس کی دھونکنی میرے اندر موجود ہے، ابھی تو چاند سورج میرے من میں ڈوبے ابھرتے ہیں آپ اپنے اندر کا کنواں کھود لیں۔ میں رسی بن جاتی ہوں، پیاس بجھانے والی رسی۔

وعدہ کریں۔ وہ وعدہ کبھی پورا نہیں کریں گے جو خدا اور انسان کے درمیان ہو۔ آپ کو زندہ رہنا ہے خاموشی سے بھی زیادہ اور مجھ سے بھی زیادہ۔

ساری چیزیں کھو گئی ہیں میرے چہرے، میرے مکر، میرے جھوٹ، میرے انصاف ساری چیزیں خالی ہیں اور کھو گئی ہیں۔

دریا کا وعدہ تم کرو۔ پیاس کا وعدہ میں کرتی ہوں۔

آپ ہرگز ہرگز خودکشی نہیں کریں گے۔

میں نہیں چاہتی کہ آپ کے آنگن میں جو تین پھول رہتے ہیں وہ میری طرح گرد کے ساتھ اڑ جائیں میں نہیں چاہتی جاوید کہ جو میری عورت اور دو بچے جو آپ کے پاس میری امانت ہیں انہیں آپ دکھ دیں۔

اگر آپ نے انہیں کسی قسم کی تکلیف دی تو جان لیجئے کہ آپ نے میرے پستانوں میں زہر بھرا۔ اس لئے کہ میں بیوی تو کبھی بھی کسی کی نہ تھی، ماں تھی اور ماں ہوں۔

اگر تم نے مٹی کا بٹوارا کیا تو میں سمجھوں گی کہ میری کوکھ داغی تھی۔ میں جانتی ہوں کہ تمہارے مندر اور تمہاری مسجد میں آگ لگی ہوئی ہے اس لئے تم کہیں بھی دعا نہیں مانتے۔ لیکن جانو۔ - - - میری آنکھیں سدا کی مکروہ تھیں۔ ابھی تو ہمارے دکھ زندہ ہیں۔

-- چلو جس دن دکھ مر گئے اس دن میں خود کہوں گی۔ ---- چلو جاوید! ہمیں مٹی پر چلتے چلتے دیر ہو گئی اب چلو مٹی میں چل کر سوتے ہیں اور ہمیشہ کے لئے آنکھوں کو نیند میں قید کر لیتے ہیں۔

وعدہ کریں کہ آپ بدن نہیں ہاریں گے۔

چھاؤں کا دوسرا نام سناٹا ہے۔ ابھی زمینوں کو چھاؤں کی ضرورت ہے۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں انشاء اللہ اداسی کا کوئی نہ کوئی حل ضرور حاصل کر لیں گے۔

خط لکھتے رہا کیجئے۔ میں جواب ضرور دیتی رہوں گی۔ خاموشی کی دیوالی کون جانے! جاوید! میں خود بہت بیمار رہتی ہوں۔ پریشان رہتی ہوں۔ اب تو کسی بھی وقت دماغ غیر حاضر ہو جاتا ہے۔ گھر والے گلیوں سے پکڑ پکڑ کر گھر لاتے ہیں اور جب دورہ پڑتا ہے تو جانے کیا کیا بولتی رہتی ہوں۔ ایکس الیکٹرک شاکس لگ چکے ہیں۔ چھ سات بار پاگل خانے میں رہ کر آ چکی ہوں۔ لیکن خدا سے دعا مانگتی ہوں اے میرے رب! پاگل ہونے سے تو موت بہتر ہے۔

میری حالت بہت خراب ہے۔ گھر سے اکیلی نہیں نکل سکتی راستہ بھول جاتی ہوں۔ تمہیں میرے دکھ کی قسم اداس مت رہا کرو۔ مجھے دکھ ہوتا ہے۔

"خانہ بدوش لگاتے ہیں جس جگہ خیمہ' اے کاش اس زمین پہ ہوتا ہمارا گھر۔"

سارا کا ایک خط
ضیاء الحق کے نام

کیپٹن جہانگیر سلیم چودھری سے سارا کی ملاقات ایک ہسپتال میں ہوئی اور سارا سے ان کا درد برداشت نہیں ہوا۔ انہیں شفا دے سکتا نہ سارا کے بس میں تھا نہ ڈاکٹروں کے بس میں۔ اس بیگانے درد سے سارا اس طرح تڑپ اٹھی کہ اس نے کیپٹن جہانگیر سلیم چودھری کو اپنا بھائی تسلیم کرلیا اور ان کے لئے پاکستان کے صاحب صدر سے مدد مانگی --
--

سنا ہے۔۔۔۔ صاحب صدر کے نام سارا کا یہ خط جنگ اخبار میں شائع ہوا تھا۔ -
--

صاحب صدر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب!

السلام علیکم

میرا بھائی کیپٹن ڈاکٹر جہانگیر چوہدری ان دنوں جناح ہسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے' صاحب صدر! وہ دو سال سے بڑے بڑے ڈاکٹروں کے زیر علاج ہے لیکن اب تمام ڈاکٹروں نے کہا کہ اس کا علاج صرف امریکہ میں ہی ممکن ہے۔

صاحب صدر! آپ نے دو سال پہلے وعدہ کیا تھا کہ میں کیپٹن ڈاکٹر جہانگیر سلیم کا علاج کراؤں گا اب میں حاکم وقت سے اپنا حق مانگتی ہوں، اور محترم صدر سے اپیل کرتی ہوں کہ اسے موت کے منہ سے بچانے کے لئے فوری طور پر امریکہ بھیجا جائے۔ اس کا تمام بدن بے جان ہو چکا ہے صرف چہرہ زندہ ہے۔

صاحب محترم! میں آپ سے اسلام کے نام پر اپیل کرتی ہوں کہ میرے بھائی کو موت کے منہ سے بچایا جائے۔ امید ہے صدر محترم فوری طور پر اپنی بیٹی کی بات سنیں گے۔

ایک بیٹی -- سارا شگفتہ

سارا کا ایک خط
ڈاکٹر سومرو کے نام

بیگانہ سے بیگانہ انسان کے درد کو بھی سارا اپنی رگوں میں اتار لیتی تھی ہسپتال میں مریضوں کی چیخیں اسے اس قدر بے چین کردیتیں کہ جب وہ خود تڑپ رہی ہوتی گھر کے لوگ اسے ہسپتال لے جاتے تو وہ ڈاکٹروں سے چوری ہسپتال سے بھاگ جاتی۔

اسی طرح ایک واقعہ جنوری ۱۹۸۴ء میں بھی ہوا اور اس بار کسی ایک ڈاکٹر کے مہربان سلوک کا احساس اسے اس شدت سے ہوا کہ ہسپتال سے بھاگنے کے وقت اس نے ڈاکٹر کے نام ایک خط لکھا اور تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ڈاکٹر سومرو کے نام سارا کا ۲۵ جنوری ۱۹۸۴ء کو لکھا ہوا خط ہے۔

ڈاکٹر سومرو!

آداب!

کاتب کی غلطیاں پہلے ہی نظر انداز کیجئے۔ آپ نے انتہائی انسانی سطح پر جو سلوک میرے ساتھ کیا ہے اسے کبھی بھی فراموش نہیں کرپاؤں گی۔

اصل میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جنرل وارڈ میں انسانی کراہتی ہوئی آوازیں میری برداشت سے باہر ہیں اور یہ میری کمزوری ہے۔ میں شور ہنگامہ میں نہیں رہ سکتی یہ میرا نفسیاتی مسئلہ ہے اسے میری مجبوری جانئے۔ ایکس رے ہوگیا ہے اور میں نے دیکھ بھی لیا ہے۔ السر ہے۔ علاج کے لئے آتی رہوں گی۔ ہسپتال میں رہنا کیا ضروری ہے؟ شور کی وجہ سے تمام رات ایک کرب میں گذرتی۔ امید ہے برا نہیں مانیں گے میں گھر جا رہی ہوں۔

انتہائی محبتوں کے ساتھ ۔ ۔ ۔ سارا

سارا کا ایک خط
احمد سلیم کے نام

یہ احمد سلیم جیسے نیک انسان کی دوستی کا تقاضہ تھا کہ سارا کئی بار پیار سے اسے "میرا پکا دشمن" کہہ سکتی تھی۔ یہاں احمد سلیم کے نام سارا کا ایک خط درج کر رہی ہوں۔

احمد سلیم!

مذاق شروع ہوتا ہے تو ساری بات ختم ہوجاتی ہے زمین میری تھکن سے بھی چھوٹی لگ رہی ہے۔ جن کو میں نے سینچا تھا وہ ہمیشہ مجھے غلیظ مٹی سمجھ کر اپنی اپنی کیاریوں میں ڈالتے ہیں۔

میرے لکھنے کے لئے کائنات کا کورا کاغذ چھوٹا ہے ان کی آنکھوں میں کورے کاغذ گرنے لگتے ہیں ویسے تو میں بہت زیادہ مالدار مشہور ہوں اور یہی میرے صبر کی لگام ہے۔ لگام سفر سے زیادہ بے سوبے ارادہ ہے۔ - - - -

میں نے اپنے خضر سے صرف اتنا کہا تھا۔ میری آواز اپنے ہاتھ میں رکھو۔ ٹھیک ہے بہت خوبصورت ہے یہ سنگ مرمر کا پھول' ہوائیں جنگل سے یہ پھول اڑا لائی ہیں اور بہت وہیں چھوڑ آئی ہیں۔ - - - سنگ مرمر کے پھولوں میں مردہ آنکھیں زندہ ہاتھ۔

میں ہنسنا چاہتی ہوں اور شاید مسکرانا بھی چاہتی ہوں لیکن پھر شاید میرے ہونٹ چھوٹے ہوجائیں۔

کافی غور سے دیکھتے ہیں۔ مجھے یہ میری ماں کے رحم کے گرے ہوئے۔ میں تو اس وقت ڈر گئی تھی جب میرا باپ میری ماں کے ساتھ قہقہہ لگانے میں مصروف تھا۔

سارے قدم رخصت ہوگئے ہیں۔ اب ساری آنکھیں جھنجھنا رہی ہیں اپنی آواز اپنے

بدن سے توڑتی ہوں اور پھر سنتی ہوں۔

اب تو آنکھوں کو پسینے آ رہے ہیں۔ مجھے پتھر مارنے والوں پر لازم نہیں کہ ایک آنکھ سے دیکھتے ہوں۔

کوئی بھی کسی وقت بھی میرے اندر خوف کے کوئیں کھود سکتا ہے اور میرے جذبوں کا گلدستہ کسی بھی چہرے پر چ جاتا ہے۔ آنکھوں کی سجاوٹ ان کے ضمیر قائم کرتی ہے اور پھر یہ باری باری میرے پاس آتے ہیں اور میں بہل سی جاتی ہوں۔

واقعی سلیم ' بہل سی جاتی ہوں۔ ان کو دیکھ کر تو مجھے اپنی پتیاں یاد آجاتی ہیں۔ ایسے لوگ کہاں ہیں جو میرے ساتھ جنگل سے آئے تھے۔ ان سے تو چہرہ چھڑانا پڑتا ہے۔

میں بار بار اپنے لہو کو بھول جاتی ہوں جیسے یہ کبھی بھی تھے نہ ہوں۔ یہ ہونٹ میرے گداگر ہیں اور بدن کے فالتو ترازو ہیں۔

دل آنکھوں کی زنجیر سے بندھا ہوا بھونکتا ہے اور میں چور پکڑ لیتی ہوں۔ میرے گھر کبھی چور نہیں آیا۔ آنکھیں بانٹنے کے باوجود کتنی تاریک ہوں!

اخلاقی طور پر میرے ہونٹ ہمیشہ سے جھوٹے ہیں۔ دل میں تو سمندر ڈرے تھے۔ کہاں کہاں رکھتی!

ہاتھوں میں کئی لکیریں گندھ گئی ہیں۔

سلیم ! سناٹے کی زبان داغتی ہوں تو کچھ ہیں جو یہ شور مچانے لگتے ہیں اور چھاؤں سے سورج اڑ جاتا ہے۔

یہ میرا آخری قیام ہے اور لوگ راز داری میں مصروف ہیں مکمل طور پر ہنس چکی ہوں اور زبان کے علم سے بچھڑ چکی ہوں۔

چراغ آگ کی زبان درازی سے جنم لیتا ہے اور اشرف المخلوق سے زیادہ مکالمہ رکھتا ہے۔

کانٹے کے ایک لباس سے کتنے پھول مرتے ہیں۔

میلے حرف آنکھ کھودتے ہیں۔

وہ چائے کی پیالی آج تک حلق میں نہیں انڈیل سکی جو مردہ دودھ سے بنائی گئی تھی۔

پیاس کے کانٹے پیس کر میری آنکھیں بنائی گئی تھیں اور نہریں مردہ کردی گئی تھیں۔

میرا جسم ایک پیڑ کی طرح تراش دیا گیا اور مجھے سفر کا ساحل کہا گیا۔

ساحل پر کوئی گھر نہیں بنتا۔ یہ صرف سمندر کا مذاق ہوتا ہے۔
صبح شام میرے بدن سے پرندے اڑتے اور رات بھر میری اڈاری میں سوتے۔ ۔ ۔ ۔
عالموں نے اپنی فال نکالی اور میرا نام سرائے رکھا۔
رات کے سائے مجھ سے گہرے ہوتے اور میری چھاؤں چھین لی جاتی۔
سو موسموں کے جھوٹ سے تنگ آکر مسافروں نے میرا نام "ٹرائی روم" رکھ دیا اور میرے مکیں اپنے یقین سے مر گئے۔
زمین میرے کئی انسان چاٹ چکی ہے لیکن مجھے روز بھوک لگتی ہے اور ہر انسان روز بھوکا ہوتا ہے۔
میری شاخوں سے گرے پتے زرد تھے اور زمین کا مذہب تھے۔
دنیا ہر ایک فرد کے بعد تیسری ہوتی ہے اور دوسرا فرد قید ہوجاتا ہے
سلیم! غیب کے کوئیں میں رسی بھونکتی ہے اور میرے انکار سے آگ بندھی ہے۔
پانیوں میں بل ڈالنے کے بعد رسی زمین پر رہن رکھ دی جاتی ہے اور پھر پیاس مجھے چکھتی ہے اور میں پیاس چکھنے کی عادی ہوجاتی ہوں۔
مجھے دیکھنے سے پہلے یہ سارے لوگ شفاف تھے۔ پھر میں نے ان کا خمیر گوندھا اور نمک سے کہا۔ ۔ ۔ ۔ چکھ!
آگ کی تلاش میں میرے کئی چراغ مجھ سے بچھڑ گئے جس کی یاد مجھے سیاہ کرتی ہے اور خاموشی میرا ڈھنڈورا پیٹتی ہے۔
سارے پیاسے سود دینے پر تیار ہیں۔ لیکن پانیوں کا سود صرف مٹی ہوتا ہے۔
میں کمیں گاہ سے کمینگی بھاگ گئی تھی سو اکیلی رہ گئی۔
میں نے آگ کے لئے برادہ اکٹھا کیا تھا لوگوں نے میرا خمیر سمجھ لیا۔
ہر گندے نالے کا ایک بہاؤ ضروری ہوتا ہے اگر ہم نے گھر سے کوڑا اکٹھا کیا ہو۔
سلیم! لگتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدا تنہا ہی ہوتا ہے۔
میرے گھر کی سلاخوں سے کتنے کتوں کی زنجیریں بنتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شمار کرو۔
کھلونے کا مقدر زیادہ سے زیادہ ٹوٹنا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اور خدا کا مقدر زیادہ سے زیادہ غضب ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔
یہ سناٹا ایک نئی قید کی پیروی کرے گا۔ ۔ ۔ ۔

تمہاری تو پکی دشمن ۔ ۔ ۔ ۔ سارا شگفتہ

سارا کا ایک خط
ثروت سلطانہ کے نام

ثروت سلطانہ پاکستان کی ایک ذہین اور بڑی احساس مند لڑکی ہے جو کراچی ٹیلیویژن پر کام کرتی تھی۔ سارا اس کی قریبی دوست تھی سارا کی موت پر اس نے تڑپ کر مجھے ایک خط لکھا تھا۔ ۱۱ جون ۱۹۸۴ء کو۔۔۔۔۔ "امرتا جی! کئی بار سوچا کہ آپ کو کچھ لکھوں مگر۔۔۔۔ اب ہمت کر بیٹھی ہوں تو کیا لکھوں! کہاں سے لکھوں! سارا چلی گئی چار جون کی رات وہ اپنے گھر کے قریب ریلوے لائن پر ٹرین کے نیچے آکر ختم ہوگئی۔ پانچ تاریخ کو شام چار بجے دفنا دیا۔ اور ذرا سوچئے کہ مجھے جو اس کی ہر بات کی خبر رہتی تھی' اتنے بڑے حادثہ سے لاعلم رہی اور مجھے سات تاریخ کو اخبار کے ذریعہ علم ہوا۔

میری بڑی کوشش تھی کہ سارا مستقل میرے ساتھ رہے' مگر عملی طور پر ایسا اس کی طرف سے ممکن نہیں تھا۔ تاہم وہ اکثر آجاتی تھی۔ اور ہم نے کافی عرصہ اکٹھے گذارا۔

امروز نے خط میں لکھا تھا۔۔۔۔۔ دوست خداؤں جیسے ہوتے ہیں کوئی مجھے یہ بتائے کہ دوست خداؤں جیسی قدرت کیوں نہیں رکھتے۔!

وہ پنجاب جانے سے پہلے مجھے ملی تھی۔ جس دن شام کو وہ واپس آئی اسی رات وہ اس حادثہ کا شکار ہوگئی۔ مجھ سے کتنی بے ایمانی کرگئی۔۔۔۔۔ کہہ گئی کہ واپس آکر بہت سی باتیں کروں گی۔۔۔۔ پچھلی بار بھی جب وہ اپنے بچوں سے مل کر پنجاب سے آئی تھی۔۔۔۔ تو بہت ہی دکھی تھی اور بڑی تکلیف دہ باتیں کرتی رہی اور اس نے بڑی بے رحم نظمیں لکھیں۔۔۔۔۔

انڈیا جانے اور آپ لوگوں سے ملنے کا بھی اسے ارمان رہ گیا۔۔۔۔۔ وہ اکثر وہاں جانے کا پروگرام بناتی رہتی۔ آخری بار بھی مجھ سے کہا تھا کہ تیاری کرلو! بس انڈیا ضرور

چلنا ہے۔ اور یہ بھی نہ ہوسکا۔ بس ایک عرصہ سے ہم پروگرام ہی بناتے رہے اس کو بہت ڈھارس اور ہمت تھی آپ سے۔ اور یوں لگتا تھا کہ وہاں جا کر اس کو جیسے نیا جنم مل جائے گا۔ جانے کس کس بات کا اور دوستوں سے کون سے رویوں کا دکھ ساتھ لے گئی ہے۔

میرے دل میں ایک آگ سی لگی ہے تمام لوگوں کے رویے اور منافقتیں دیکھ کر۔ یہاں کے پریس کی بے حسی دیکھ کر۔

ارے امرتا جی! ان نادانوں کو کوئی کیسے سمجھائے کہ کیسی ہستی چلی گئی ہے۔ کیا پاکستان میں لکھنے والوں میں کوئی اس کے مقابل کھڑا ہونے کی ہمت رکھتا ہے؟ مگر کیا کریں!۔۔۔۔۔ کس کس بات کا رونا۔۔۔۔۔

میں سمجھتی ہوں کہ دوست کی زندگی میں یا موت کے بعد کچھ لمحات آتے ہیں جہاں غیر متعلق ہونے اور خاموشی اختیار کرلینے سے بڑھ کر چھوٹا پن کچھ نہیں سارا کا تو نہ جانے کس کس پر جسم و جان اور دل کا قرض ہے۔

میں نہیں جانتی زندگی میں کبھی میری ثروت سے ملاقات ہوگی یا نہیں، لیکن یہ خط ملا تو میں نے ثروت کو اپنے دل کے قریب محسوس کیا اور بھری آنکھوں سے اسے ایک خط بھی لکھا۔ اس کو اس کی نظر کو جس نے سارا کو پہچانا تھا۔۔۔۔

اب سعید کی مدد سے مجھے سارا کا ایک خط ملا ثروت کے نام لکھا ہوا جس پر کوئی تاریخ نہیں ہے اور اس خط میں سارا نے بچوں کی طرح جس پیار سے پہلے کٹی لفظ لکھا ہے اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ثروت اس کی بہت قریبی دوست تھی سارا کا وہ خط یہاں درج کر رہی ہوں۔۔۔۔۔۔

ثروت!

کٹی!

بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پھر سوچتی ہوں آج کل تم مصروف ہو۔ کچھ دن اور سہی۔۔۔۔۔ میں تمہیں اداس دیکھتی ہوں تو دکھوں سے ایک اور آنکھ آن ملتی ہے اور کہتی ہے۔۔۔۔۔

سارا! تیری ثروت بہت اداس ہے۔

کیا کروں دوست! دکھوں کا بٹوارا نہیں ہوتا ورنہ تو ہماری زمینیں الاٹ ہو چکی ہوتیں۔ تم پاکستان میں پہلی لڑکی ہو جسے میں دوست کہہ سکتی ہوں۔

اور میری خوش قسمتی ہے کہ تم میری دوست ہو!
خدا تمہیں سکھ دے اور تو اپنی قلم سے "آنکھیں" لکھے!
میں اکثر تمہارے بارے میں سوچتی رہتی ہوں اور تمہارے لئے پریشان رہتی ہوں۔
لیکن کیا کروں!

اداسی کا ایک سمندر میری کشتی میں آن بیٹھا ہے۔ چاہتی ہوں تمہیں ستار سناؤں لیکن ستار کا ہاتھ کٹ چکا ہے اور وقت آواز کتر چکا ہے۔
زندگی میں کبھی مجھے اس طرح کسی نے نہیں چاہا جس طرح تم مجھے چاہتی ہو۔

سارا کا ایک خط
کشور ناہید کے نام

کشور ناہید پاکستان کی ایک مانی ہوئی شاعرہ ہیں جن کے نام لکھا ہوا مجھے سارا کا ایک ایسا خط ملا ہے جو میری نظر میں ایک تاریخی خط ہے لکھتی ہے-----

کشور ناہید!

اگر مسجد میں دعا مانگتی ہوں تو مندر روٹھ جاتے ہیں گھر کی یہ سوداگری ہمیں کیوں بسر کرلے۔

جسم کی لاٹھی پر کسی جنگل کا نام نہیں لکھا ہوا۔ جانتی ہوں' عورت کے لہو سے جھنڈیاں بنائی جاتی ہیں اور اسے اس کے بل بتائے جاتے ہیں------

یہ کفن ناپنے والے اپنے جسم جتنا گز رکھتے ہیں لیکن ہم سر پر کفن باندھ کر پیدا ہوئے ہیں----- کوئی انگوٹھی پہن کر نہیں جسے وہ چوری کرلیں گے۔

وہ ہماری ہنسی میں آیت کیوں ڈھونڈتے ہیں ؟ جب کہ ہر آیت میں شیطان کا ذکر ضروری ہے-----

سارا کا ایک خط
راجیندر سنگھ بیدی کے نام

سارا کا ایک اور تاریخی خط مجھے ملا ہے جو کسی دن کسی ایسی ذہنی کیفیت میں لکھا ہوا لگتا ہے جب سارا دیوتا کے وصل سے دیوتا کا ایک بیٹا پیدا کرنا چاہ رہی تھی۔ ـ ـ ـ ـ

یہ خط اردو کے مشہور افسانہ نگار راجیندر سنگھ بیدی کے نام ہے۔

جس میں لمبی لڑکی بیدی کے ایک افسانے کا نام استعمال کیا ہوا ہے۔ خط پر کوئی تاریخ نہیں ہے۔

بیدی!

میں ایک جاہل کنواری ہوں! سامنے دہلیز پر میرے بچے کا قدم لکھا ہے اور اس کے قدم کی لکیروں پر میں نے اس کے باپ کا نام نہیں لکھا۔ سوچا' پہلے تمہیں خط لکھ دوں۔ پھر مٹی کو پڑھوں۔ تمہاری زندہ تحریریں اور وقت کے کشکول میں جو تمہارے آج کے دن میں ایک "لمبی لڑکی" ہوں لیکن میں پھیرے لگاتے ہوئے دوہری نہیں ہوئی کہ میرے پیٹ میں کسی کی خواہش پل رہی تھی۔ میری دادی تو صدیوں سے دیکھ رہی ہے کہ میں امید سے ہوں۔ لیکن میرے یہاں کوئی جسم نہیں ہوپاتا۔ میری ماں نے ایک بوڑھا دیوتا جنم دے رکھا ہے جو روز مجھ سے ہم بستری کی کوشش میں رہتا ہے لیکن میں کنواری ہی رہ جاتی ہوں۔ ـ ـ

ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

خون کی مہندی

کنڑ کے ایک مانے ہوئے ادیب شری شیو رام کارنت سے جب کسی نے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کا زندگی نامہ لکھنا چاہتا ہوں تو اس وقت کارنت ہنس دیئے کہنے لگے۔ ـ ـ ـ ـ "بھائی! تمہیں میرا قتل کرنے کی کیا ضرورت ہے جب کہ میں خود اپنا قتل کر سکتا ہوں۔ ـ ـ ـ ـ "

دنیا کے کسی بھی ہتھیار کو کوئی قتل معاف نہیں کیا جاسکتا لیکن قلم وہ ہتھیار ہے جسے اخلاق کی عدالت میں قلم کار کو اپنا قتل معاف ہوجاتا ہے۔ ـ ـ ـ ـ ـ

ہم جو بھی ادیب اپنی زندگی کی داستان لکھتے ہیں خود اپنے قاتل ہیں' لیکن اخلاق کی عدالت میں ہم باعزت بری ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جب سارا نے مجھے بہت اداس خط لکھے تو میں نے سارا سے کہا۔ "تم اپنی قلم سے پوری داستان لکھو۔"

سارا نے اپنی داستان لکھی اور سارا کو قتل کرنے کی جس دھمکی کا ذکر سارا نے اپنی داستان میں تفصیل سے لکھا ہے' وہی واقعہ مختصر لیکن ٹھیک انہیں لفظوں میں سارا نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو بھی لکھا۔ ان لفظوں کے ساتھ "اب خدا کے بعد قانون کا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہوں۔ ـ ـ ـ ـ "

سپرنٹنڈنٹ پولیس کو یہ خط لکھنے سے پہلے سارا نے تھانہ شاہ فیصل کالونی نمبر ۲ میں اپنی رپورٹ درج کروائی تھی۔ وہ رپورٹ اور یہ سپرنٹنڈنٹ پولیس کا لکھا ہوا خط ضرور ان کی فائلوں میں ہوں گے میں ان کا ذکر محض اس لئے کر رہی ہوں کہ قتل اور قاتل کا فرق آپ کے سامنے رکھ سکوں۔ ـ ـ ـ ـ

دنیا میں بہت تھوڑے سے ادیب ہیں جو اپنے ہاتھوں پر اپنے خون کی مہندی لگا سکتے ہیں اور میں مانتی ہوں کہ سارا ان تھوڑے سے گنے چنے لوگوں میں سے تھی۔ ـ ـ ـ ـ

سارا کا آخری خط
عطیہ کے نام

سارا نے مجھے ایک خط میں لکھا تھا "آج ثروت کو سلیم کا خط ملا کہ امرتا کا حکم ہے کہ سارا عطیہ کے گھر پر رہے اب میں عطیہ کے گھر پر رہ رہی ہوں۔اس خط میں جس عطیہ کی بات ہے میں اسے ذاتی طور پر نہیں جانتی۔ عطیہ کی تعریف میں نے احمد سلیم سے سنی تھی اور یہ بھی کہ اگر کوئی دوست سارا کو پیار اور عزت سے اپنے پاس رکھ سکتی ہے تو وہ صرف عطیہ ہے۔ یہ ۱۹۸۴ء کی بات ہے جولائی کے مہینہ کی جب احمد سلیم ہندوستان آئے ہوئے تھے اور میری طرح پریشان تھے کہ سارا نے امی کی موت کے بعد گھر چھوڑ دیا ہے لیکن اس کے پاس رہنے کو کوئی ٹھیک جگہ نہیں ہے-----

ان دنوں فرانس میں ہوئے حادثے سے میرے داہنے بازو کی ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی اور میں اپنے ہاتھ سے خط نہیں لکھ سکتی تھی۔ احمد سلیم نے عطیہ کی بہت تعریف کی تو میں نے انہیں کہا کہ وہ میری طرف سے سارا کو لکھ دیں کہ جب تک وہ ہندوستان نہیں آتی تب تک وہ عطیہ کے یہاں رہے۔ سارا کا خط مجھے اسی خط کے جواب میں ملا۔

اور جب دو سال بعد ستمبر ۱۹۸۵ء میں سعید احمد سارا کے کاغذات لے کر کراچی سے آئے تو انہیں سے مجھے عطیہ داؤد کا تعارف ملا کہ وہ بہت ہی ذہین لڑکی ہے، سندھی زبان میں نظمیں کہتی ہے اور کئی بار سندھی میں لکھے ہوئے کلام کو اردو میں ترجمہ کرتی ہے۔ اکیلی ہے ماں کے پاس رہتی ہے اور سارا بہت دن اس کے پاس رہی تھی-----

اس خط سے لگتا ہے کہ سارا نے اس وقت تک خود کشی کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ہوسکتا ہے یہ خط عطیہ کو مل جاتا تو وہ کسی نہ کسی طرح سارا کا ارادہ بدل سکنے میں کامیاب ہوجاتی۔ لیکن یہ خط عطیہ کی کتاب میں پڑا رہا اور بیس دن کے بعد جب سارا خود کشی کر

چکی عطیہ بہت رو چکی۔۔۔۔۔ تو ایک دن اسے اپنی کتاب میں پڑا ہوا یہ خط ملا۔۔۔۔۔ لکھا تھا۔۔۔۔۔

یہ خط تمہیں اور تمہارے از سیلف کو سلام کرنے کے لئے لکھا ہے۔۔۔۔

۱۹۸۴ - ۴ - ۱۱

عطیہ !

زندگی کی اپنے ٹکڑے کاٹ کاٹ کردیتی رہی اور موت ایک سنسار

پیاری دوست! تمہیں کیا دوں ؟

دیکھو! میرے اسباب میں نہ روح رہی' نہ کوئی بدن۔ میں آج بہت اذیت میں ہوں۔ وہ اذیت جو کنواریوں کو لازم ہے مجھ پر نہیں۔ وہ اذیت کی سانپ چال بدن پر رہ جائے' وقت پر رہ جائے اور میں ٹھہر جاؤں۔ تمہارے دل میں ایک گٹھری ہوئی اور گرد آلود سانس کے ساتھ ہمارے انگاروں سے مجھ پر میرے کپڑوں کی راکھ پڑی ہو۔۔۔۔۔۔۔۔

تمہاری اور اپنی اپنی چتا کے گیت لکھیں اور آگ کو گانے دیں اپنی پوری خاموشی کے ساتھ۔۔۔۔۔۔

میں کیا ہو گئی ہوں عطیہ کے آنسوؤں سے پہلے میں خاک تک پہونچ جاتی ہوں۔ آؤ اپنے اپنے انگاروں کے بجھنے تک تو جئیں۔ لیکن لگتا ہے۔۔۔۔ زندگی ہمارے کھلونے کبھی بھی نہ توڑ سکے گی۔ لیکن یہ کھلونے ہمیں ضرور توڑ چکے ہیں یہ ٹوٹے کھلونے عطیہ آدھے میرے بچوں کو' آدھے سعید کو دے دینا کہ آنے والے کل میں میں بھی بک شیلف میں تمہیں بچی ملوں گی۔ اور تم بھی مجھے بک شیلف میں بچی ملو گی۔

سارا

ایک تھی سارا
ایک تھا سعید

ایک مدت ہوئی جب میں نے اسٹائین بیک کا ایک ناول پڑھا تھا۔ ۔ ۔۔ آف مائس اینڈ مین ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا کردار ایک نہایت معصوم انسان ہے۔ اسے دنیا کی کچھ خبر نہیں۔ اس کی تمنا صرف اتنی ہے کہ وہ بہت خوبصورت اور ریشم سی چیزوں کو ہاتھ سے چھو کر دیکھے۔ گھر بازار اور گاؤں شہر میں کوئی ایسا انسان نہیں جو اس کی معصومیت کو سمجھ پائے۔ صرف ایک دوست ہے' جو اسے سمجھ پاتا ہے اور ہر قدم پر اس کی حفاظت کرتا ہے۔ لیکن ایک وقت آتا ہے جب اس دوست کے لئے اس کی حفاظت کرسکنا اس کے بس میں نہیں رہتا۔ ۔ ۔ ۔ وہ جانتا ہے کہ ابھی جو لوگ اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں ایک وحشت ان کی آنکھوں میں سمائی ہوئی ہے۔ ۔ ۔ ۔ اور ابھی وہ ان کے ہاتھ آجائے گا اور ایک بہت بری موت اس کا حشر ہوگی۔ ۔ ۔ ۔ اس وقت وہ دوست لوگوں کی آنکھ بچا کر اسے ایک پہاڑی پر لے جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ جانتا ہے لوگ پیچھا کر رہے ہیں' وقت بہت کم ہے' لیکن وہ اطمینان سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہے اور کہتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھو! پہاڑی کے نیچے یہ وہی جگہ ہے بہت ہریالی ہے اور ندی کے کنارے' جہاں تم اپنا ایک چھوٹا سا مٹی کا گھر بنانا چاہتے ہو' اور چاہتے ہو کہ وہاں چھوٹے چھوٹے چوزے کھیل رہے ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دوست کی باتیں اتنی پیاری ہیں آواز اتنی میٹھی کہ اس کی آنکھوں میں زندگی کا سپنا تیرنے لگتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ اسے کچھ خبر نہیں کہ ہاتھوں میں تیز چاقو لئے اس کا پیچھا کر رہے لوگ اب بالکل قریب آنے کو ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اور جب اس کی آنکھیں ایک سپنے سے بھر جاتی ہیں تو اس کا دوست آہستہ سے اسے گولی مار دیتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ اسے سے پہلے کہ وہ ایک وحشیانہ بھیڑ کے ہاتھ آجائے۔ ۔ ۔ ۔

آج ----- جب میں سارا کے سعید کے نام لکھے ہوئے خط پڑھ رہی ہوں تو مجھے لگتا ہے میں اسٹائین بیک کے جس کردار کو ایک مدت ہوئی پڑھا تھا اسے آج پہلی بار دیکھ رہی ہوں-----

سارا کو ہسپتال میں بھی رہنا پڑا اور پاگل خانوں میں بھی ---- اور جمہوری نظام کو پسند کرنے کے الزام میں لاہور کے لال قلعہ کی دیواروں کے اندر بھی ---- اور جب ہونٹوں پر گالیاں اور ہاتھوں میں چاقو لئے ایک بھیڑ اس کے پیچھے چلنے لگی تو خدا اس کا ایک ہی دوست تھا' جو سارا کی معصومیت کو پہچانتا تھا اور اس نے لوگوں کی نظروں سے بچا کر سعید کی صورت میں سارا کی آنکھوں میں ایک بہت خوبصورت سپنا بھر دیا---- اور جب اس کی آنکھوں میں زندگی کا سپنا تیرنے لگا تو اسے زمین سے اٹھا کر آسمان کی گود میں رکھ دیا -----

سارا کے سعید کے نام لکھے ہوئے کچھ خط ہیں- .

سعید!

جیسے آپ نے میرا ساتھ دیا ہے کبھی فراموش نہیں کر سکتی- آپ کی اعلیٰ ظرفی نے مجھے متعارف کر دیا ہے- کبھی دل میں یہ خیال مت لائیے گا کہ میری وجہ سے آپ کو کوئی دکھ پہونچے- اگر میری کسی بھی بے وقوفی سے پہونچتا بھی ہو تو جانئے گا ----- میری نیت کا دخل نہیں رہا ہو گا-

میرے قدم تو اندھیروں کی نذر ہو جاتے----

میرے گھر جو پھول ہنس پڑے ہیں آپ ہی کی وجہ سے----

امید ہے' زندگی جو میری تھوڑی بہت رہ گئی ہے اسے سانس لینے میں ساتھ دو گے-

میرے دل میں جو آپ کے لئے عقیدت کے پھول کھلے ہیں تو مہک اٹھی ہوں- جانے کیوں!

یاد رہے---- خوشامد کے میں سخت خلاف ہوں زندگی میں بعض محرومیوں کی وجہ سے یہ بھی رہی- میں نے تو کسی کنکر کو بھی تکلیف نہیں دی یعنی جذبوں کو-

آپ نے تو مجھ میں انسانی قدروں کو پیدا کیا ہے اور انسانی سطح پر مجھ سے ملاقات کی ہے- .

۸۳ - ۱۱ - ۲۶

سعید!

"بات وقت کے ننگے جسم پر آتی کیوں ہے؟" ----- آپ کے ان لفظوں کو میں نے پوری تھکن سے پڑھا۔ بات جسم جتنی ہوتی تو قلم کی سیاہی کو اپنی تحریر کی بینائی سے کبھی بھی حاملہ نہ کرپاتی۔

ردی کے بدن کو تو عالموں نے بھی اپنے گھر نہ رکھا۔ مگر آپ نے ایسا کیا آپ کے یہاں انسان کی بڑی پہچان ہے۔ اور میرے لئے یہ بہت بڑی بات ہے۔ میں آپ کے پاس فقط ایک بات کے لئے ننگے بدن بھی آئی۔ یہ بھی سچ ہے۔ لیکن چلتے چلتے جانے کس روز میں بدن کی لاٹھی ٹیکنا چھوڑ کر آپ کے ساتھ روح کی لاٹھی سے چلنے لگی۔ اور یہ سچ ہے۔

رہی بات پھر وقت کے ننگے بدن کی۔ --- میری گھڑی کے مطابق وقت کی صلیب پر میخوں کا شور ہے۔

موت راہ گذر سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی یوں۔ --- جانیں انسانوں نے خدا کی عبادت کی ہے اور میں نے انسانوں کی عبادت کی ہے اور میری کوئی بھی ریاضت صرف گنبدوں تک نہ گونجی تھی، ہم نے تو اپنے فرشتوں کو بھی نیک رکھا کہ بدی کا فرشتہ بڑا چغلخور ہوتا ہے۔

میں اتنی تاخیر میں کیوں آئی ننگے بدن----

تو کہوں گی۔ --- انصاف کے ایک پلڑے میں ہمیشہ پتھر تلتے ہیں سو فرض کی سولی آج بھی مجھے ڈستی ہے۔

اور اس فرض سے میرا اقرار ایسا ہے کہ نہ تو میں سو سکتی ہوں نہ ہی سوتی ہوں ایک آدھ فرض بقایا جات میں رہ گیا ہے اور ان فرض کے پھولوں کے لئے کہوں گی۔ ---

اے پھولو---! میں نے سولیوں پر بھی سوچا ہے تمہیں!

خیر کڑیوں کڑیوں زنجیر کا یہ بدن ختم ہوجائے گا۔ یوں تو انسان کی تعریف کرنا انسان کی توہین ہے، لیکن کیا کروں، آپ کو انسانی سطح پر بہت بلند پایا ہے۔ آپ کے سامنے اپنے آپ کو بہت محسوس کرتی ہوں جب بھی مجھے کوئی میرا چھوٹا رویہ حفظ کرتا ہے۔

میں نے مرد سے ہمیشہ نفرت کی ہے۔ اس کی وجہ میرا باپ ہے۔ یہ بات سارا برصغیر جانتا ہے اب تک تاریخی طور پر یہ بات ہی نوٹ ہے' لیکن آج میں یہ بات لکھتی ہوں سعید ! میرے دل میں تمہارے لئے بے پناہ محبت جاگ گئی ہے۔ لگتا ہے جیسے تم نے مجھے میری روح سے سجا دیا ہو۔

ایسا وجدان تم نے میرے اندر پیدا کیا ہے کہ ہر چیز انکاری ہونے لگی ہے۔ ایسا کیوں ؟ سوچتی ہوں اور اپنی ہی کسی کمی کی وجہ سے بہت ڈر جاتی ہوں۔

بولو ! چراغوں سے آگ کا شور چھینو گے تو نہیں ؟ لیکن کیا کروں "بلدے اکبر" سے بھی اچھے لگتے ہو !

سارا شگفتہ

۳ - ۱۲ - ۸۳

سعید !

تمہارے قدموں کی سچائیاں میرے مٹی جیت چکی ہیں۔ وجد کا کوئی اہتمام نہیں کرتا۔ سعید ! سارا کا ایسا ہی وجد ہے۔ میری خاموشی کو تم اپنی مٹی سے گرا نہیں سکتے کہ کناروں کی ہتھیلی پر بہتا سمندر ہوں۔ - - - - - میں تمہارے لئے ہوں۔ ریت کی پیاس سمندر نہیں بجھاتا انسانی قدم بجھاتے ہیں۔ میں ریت تھی اور تم سمندر پر چلتے ہوئے میرے تخم میں اپنے قدم رکھ گئے۔ میں نے جانا۔ - - - یہ قدم ہی میرا سفر ہے۔ سوچ۔ - - - قدم کبھی نہیں ہوئی' جب سے میرے دل کو تم نے سعید ! زبان دی ہے۔

سارا

۲۰-۱-۸۳

سعید !

میرا آدھا وجود کیا تمہیں ہمیشہ پکارتا رہے گا ؟ کیا مجھے اپنے آدھے وجود سے تمام رات جاگنا ہوگا ؟ یہ بس حد ہے - - - سعید ! مجھے اور میری رات کو الگ الگ قید کر جاتے ہو۔ یہ کون سا ترازو ہے جس کے ایک پلڑے میں میرا آدھا وجود اور دوسرے پلڑے میں

میری آدھی رات تڑپتی ہے ---

میں تمہارے انتظار کی چتا پر ستی ہوتا اپنی معراج جانوں گی سعید!

تم نے مجھے چتا کے دھوئیں سے انسان بنا دیا ---

تمہاری -- سارا

۲۰-۱-۸۴

سعید!

تم چلے جاتے ہو' تو اس خوف سے ہی سوچیں اپنی آنکھیں قید میں جھکا لیتی ہیں۔ اور سوچوں کا بھی انتظار کرنا پڑے تو انتظار کے باطن میں کیا تلاطم ہوتا ہوگا؟

کوئی سپہ سالار اپنا میدان اور گھوڑا فروخت نہیں کرتا' لیکن انتظار اور دوری اپنی اپنی اکائیاں خوب جانتے ہیں۔ سوچوں کو لفظ لفظ کر دوں تو میری کتاب کھو جائے گی سعید! یقیناً" ہمارا سفر اس سے آگے کا سفر ہے بار بار مجھ سے میری تردید مت چاہو!

پاگل ہمیں اندھے لفظوں کو اب بولنے کا حق نہیں دینا چاہئے ہمارا آنسو کیا ہم سے بانکان گفتگو نہیں کرتے؟...... اس سے بڑا ناطہ کون سا ہوتا ہے سعید! کھنڈر زمین کا لہجہ ہوتا ہے پھر بھی کہتے ہو --- چپ رہتی ہوں؟

سچائیوں سے پوچھو میں کب چپ رہی۔

میں نے اپنے سعید کو کب کب اور کیسے کیسے تنگ نہیں کیا۔

اس جذبہ پر کسی بھی لفظ کی سچائی نہ چاہوں گی۔

تم چلے جاتے ہو سعید تو گھڑی کی صلیب سے میری لاش کتنی بار گرتی ہے انہیں ابھی اندازہ نہیں۔

تنہائی کا لفظ بھی بس اتنے مفہوم میں اتنا سا ہی ہے۔

بار بار مجھ سے میری تردید مت چاہو۔

تمہاری گھڑی کی ٹک ٹک مجھے اتنا بیدار رکھتی ہے کہ نیند اپنے کشکول میں سوتی ہی نہیں ۔ ایک بات بتاؤں .... ایک تھی سارا' ایک تھا سعید۔ وہ دونوں اتنا چاہتے تھے اور اتنا کہ لفظ کم کہیں نہیں رہ جاتا تھا۔

ٹیگور کا ایک گیت یاد آرہا ہے ۔ تو ہی میرا سمندر ہے ۔ تو ہی میرا ناخدا اور میں ایک

کشتی ہوں، تمہیں کنارے لگانے کو کیوں کہوں! ڈوب بھی جاؤں تو تجھ میں ہی ڈوبوں گی، کیونکہ تو ہی میرا سمندر ہے، تو ہی میرا ناخدا۔

یہ گیت جانے کیوں دن دن اور پھر دن دن بھر دوہراتی رہی۔

تمہاری۔ سارا

۱۵-۲-۸۴

سعید!

آنسو ارزاں نہ تھے۔ یہ میں تھی۔

میری امی کی قبر میں ایک یہ بھی حسرت رہی ہوگی کہ وہ کبھی اپنی بیٹی کے آنسو، ارزاں آنسو دیکھ سکتی۔

رات میرے ساتھ ساتھ بہت رو رہی ہے۔ آنسو کا قحط اپنی دیر رکھتا ہے۔ گھر میں سب سو رہے ہیں اور میں پھر آنسوؤں میں روانی کی جاگ لگائے، صبح کا اور تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔

آج بہت رلایا ہے تم نے پگھٹ کی یہ رم جھم تو تم نے بخشی ہے ایک سچا پگھٹ۔ رات تم اور آنسو، رات کو کتنا سجائے ہوئے ہیں۔

ایک لائن ہے میری ۔۔۔ "ہمارے آنسوؤں سے آنکھیں بنائی گئی ہیں۔"

اور آج تم کہتے ہو سعید! کیا کہتے ہو! سارا کی آنکھوں میں اس وقت بھی آنسو نہ تھا، جب سارا کا بچہ مرا تھا۔ سارا تو اس وقت بھی نہیں روئی، جب لاہور قلعے میں ڈکٹیٹر نے میری بے حرمتی کی۔ یہ ایک بڑی داستان ہے۔ آنے والا وقت اس سے تیری داستان کیا لکھے گا، جہاں بے زبان سلاخوں اور بے زبان بیڑیوں کو میرا قدم جانا گیا۔۔۔

سارا تو اس وقت بھی نہیں روئی، جب اس کا چہرہ روٹی سے بڑا نہ رہ گیا تھا۔ حالانکہ جب انسان کو پیدا کیا گیا تو اسے بھوک سے افضل پیدا کیا گیا۔

میری آنکھیں پھر ارزاں ہیں۔ اور آنسوؤں کی لاشیں میرے ہی سینے پر پڑ رہی ہیں۔

رات کے تین بجے ہیں اور گھڑی کہہ رہی ہے کہ سب سے زیادہ فضول خرچ آنکھ ہوتی ہے۔ ارزاں کیوں ہو جاتی ہوں؟ مجھے بتاؤ!

میں تو سادے ورق سے زیادہ چپ رہ سکتی تھی۔

تمہاری سارا

فروری ۸۴ء

سعید!

آؤ باتیں کرتے ہیں۔

تمہاری سچائیوں کے آگے میں بہت ہی ۔ ۔ ۔ ۔ بہت ہی میلی ہوں سعید! اس لئے اجلے اجلے لفظوں کی سچائیوں کے چہرے پر کندہ کرتی ہوں سچ تو تم کہتے ہو۔ سچ تو تم سہتے ہو جو ماضی جھوٹ سے شروع ہو' اس کی تان سچ ہی ہوتی ہے۔

تو چلو! دیکھو! سنو سعید! میلی سچائیاں ایک دن سچ کی سچائیاں بن گئیں اور میرے گدلے لہو میں ایک کمل کھلا ۔ کمل نے میرے گدلے ظرف کو اپنے ظرف سے ڈھانپ لیا زندگی کی پہلی چھاؤں دیکھ کر میں نے پانیوں سے بھنور نکال پھینکے اور شفاف ہوگئی۔

جھوٹ کے گرد دواروں کو اپنی پوری سچائیوں سے چمکانے لگی میں اپنی دلدل سے نکلی یا نہیں نکلی یہ جانو تم! اور یہ سب تم اس لئے جانو کہ ایک بھکارن سارا شگفتہ کو تم نے اس کی چتا سے اسے بیدار کیا اور اپنے وسیع سینے میں جینے کی تمیز سکھائی' پھر اسے بولنا سکھایا۔ تم نے سے سچ بولنا سکھایا یا جھوٹ ۔ ۔ ۔ یہ میں اور تم جانو!

میں پھر بھی اکثر جھاڑیوں میں گر جاتی۔ تم پھر مجھے جھاڑیوں سے اٹھاتے اور تمہارے لہو کے قطرے میرے بدن پر گر جاتے۔ میں تمام دن تمہارے ان قطروں کی حیا میں رہونگی۔

چلو پھر باتیں کرتے ہیں۔

تمہارے سامنے میں اپنی حیثیت کو تنکے سے بھی زیادہ نہیں پاتی کہ میرا خمیر تیری آگ سے اٹھا' اور سارا نے دیکھا۔ ۔ ۔ کیا دیکھا کہ اس کی سنسان آنکھوں کو کوئی دیکھتا ہے۔

اس کے سنسان قدم اب کسی کی دریافت ہیں۔ وہ تنہائی کی کال کوٹھری میں حقیقت سے زیادہ بیدار ہوگئی ہے وہ ایک قدم نہیں رہی' وہ دو قدم ہے

میں نے بلوں میں رہنا چھوڑ دیا ہے اور سوکھے ٹکڑے گھروں سے چوری کرنا بند کر دیے ہیں کہ غاروں کی تنہائیوں کو تم نے میرے ذہن سے نوچ پھینکا ہے۔

میں اندھیروں میں دھڑکنے لگی تھی۔ تمہاری لو اتنی زیادہ تھی کہ تم نے مجھے میرے مذہب بتائے۔

تم نے میرے بدن سے میخیں نکالیں اور طلسماتی حصار توڑا۔

مجھے خبیث روحوں کے مکان سے رہائی دلائی۔
مجھے میرے اصل سے آگاہ کیا۔
چلو لوٹ کر باتیں کرتے ہیں۔

جب میری زبان رکتی تو تم نے میری خاموشی کو آواز بخشی ۔ حالانکہ اس وقت تو تمہیں معلوم تھا کہ میں بولی بھی تو پرائی آوازوں میں بولوں گی اور پھر اس کے بعد بے شمار پرائے حالات پر پرائی آوازوں میں بولتی رہی۔ تم پھر بھی پرائے نہ ہوئے۔

تم نے مجھے آواز دی تو اس وقت میں اپنے جھوٹوں کے بے شمار پتھروں تلے دبی ہوئی تھی۔ اور تمہاری آواز پاکر ایک ایک پتھر پھینکنے لگی۔ میری پتھر کی زبان بھی ٹھیک ہوگئی۔ تمہاری آواز زبان پر رکھنے سے۔

تم نے مجھے اتنی شکتی دی کہ میں اپنی بساط سے زیادہ زندہ ہوگئی

سنو ! تمہاری آتما اتنی سندر ہے کہ ایک لہو تھوکتی عورت کے زخم میں تم نے سیندور بھرا' زندگی کا سیندور

میری گور کو بھی اپنی گود میں رکھا' اور حد نگاہ تک میری نوکیلی چٹانوں سے لڑھکتے ہوئے پتھروں کو بھی تم نے موسم دیئے۔

میری پتھریلی روح کو بھی پاش پاش کر گئے۔ میں نے کیا کیا زہر کھالیا اور تمہیں اذیتوں کی انتہا پر رکھا۔ - -

"جینے والا دن اپنی اس موت پر شرمندہ ہے'

آج کی بات ہے' تم نے کہا' اگر ہم نے انتہائی قدم اٹھایا تو سب کچھ بھسم ہو جائے گا۔

پر چھائیوں کے مقدر میں کبھی دیوار ہوتی ہے اور کبھی دہلیز بھی نہیں - - -

سعید ! جس طرح چھاؤں میں سورج کو قید نہیں کیا جاسکتا ' اسی طرح میں ابھی تک۔ - ابھی تک - - ایک نہ ایک' کوئی نہ کوئی پرواز رکھتی ہوں۔ تم نے میرے دکھوں کی بھی عبادت کی ہے۔ ذرا سوچو ! سنو ! میں تمہار گھر' پھر ایک گھر بھی نہیں' دو گھر برباد کر سکتی ہوں ؟

مجھ میں اتنی شکتی نہیں۔ میں ابھی اتنی زیادہ نہیں مری ۔ مجھے تم سے زیادہ تمہاری بیوی' میری عورت' تمہارے ' اور میرے بچے اور بہن زیادہ عزیز ہیں۔ میں ان کی خوشیاں

ان کے آشیانوں سے نہیں چھین سکتی' گویا کہ میری سچائی فٹ پاتھی سچائی ہے۔ اور بے گھروں کا سب سے بڑا سچ --- گھر ہوتا ہے۔

گھروں کی حفاظت میرا فرض اولین ہے اور تمہارا بھی۔

"انسانوں کو پانے دکھوں کا احترام کرنا چاہئے۔ جو انسان اپنے دکھوں کا احترام نہیں کرتا' تو قربان گاہیں اس کا احترام کرنا بھول جاتی ہیں۔"

کل کی بات "" میں جو کچھ کماؤں گا اس میں سے آدھا تمہارا ہوگا" --- سعید! مجھے دولت --- پراپرٹی --- سے شدید نفرت ہے میں کیا کروں گی اتنے سارے سکوں کا' پیسوں کا' مجھے اتنی رقموں کی ضرورت نہیں ہے کہ میرا وقت اتنی قیمتی نہیں ہے۔ میں ایک معمولی بھکارن ہوں۔ چار روز بعد آدمی روٹی کی ضرورت ہوتی ہے اور ایک گلاس پیاس کی ضرورت ہوتی ہے۔

طبیعت کی خرابی کی وجہ' کچھ مسائل میں دیر ہوگئی۔ میں پوری کوشش میں ہوں کہ میں خود بنیادی مسائل حل کروں۔

اور کوئی وجہ نہیں کہ میں بہت جلد یہ مسائل حل نہ کر لوں۔

تم دعا کرنا کہ یہ ہمیں تمہاری ہی بخشی ہوئی ہیں۔

ویسے تمہارے اس عظیم جذبہ کو میں دلی طور پر خراج تحسین پیش کرتی ہوں کہ تمہارا یہ رویہ معمولی رویہ نہیں۔ میں تمہارے اس جذبہ کی بہت قدر کرتی ہوں۔

توں کی جانے پنجرے وچ تتے پر دی حیاتی
توں کی جانے جدن انگاراں نال ٹرنا پے جاندا ہے
توں کی جانے!

تمہاری - سارا

۲ - ۴ - ۸۴

خودکشی سے پانچ دن پہلے

چار جون کی نامراد رات سے چار دن پہلے 31 مئی تک سارا اور سعید کوئٹہ میں اکٹھے تھے۔ وہیں تیس مئی کے دن سارا نے سعید کے نام ایک خط لکھا اور سعید کے تکیہ پر رکھ دیا۔

خط میں کہیں اشارہ نہیں ہے کہ سارا کو موت کی کشش اپنی طرف لے جا رہی ہے۔ لیکن پانچ دن بعد جو واقعہ ہوا' اسکی روشنی میں اس خط کو دیکھیں تو لگتا ہے' جیسے سارا نے جان لیا تھاکہ موت بڑی شدت سے اسے اپنی طرف بلا رہی ہے۔ اور اگر آج اس نے سعید کے پاس ہوتے ہوئے بھی ' سعید کو خط نہیں لکھا تو زندگی کا ایک قرض اس پر رہ جائیگا۔ - - -

یہ خط سعید کی محبت کا شکریہ ادا کرتا ہوا' خاموشی سے الوداع کہتا ہوا بھی لگتا ہے - - - - -

سعید !

تم نے زندگی میں جو خوشی' عزت' محبت مجھے دی ہے وہ زندگی میں آج تک کسی نے نہیں دی تھی۔

دنیا کی ساری زمین پر ایک تم ہو' تم ہو سعید ! جس نے سارا کو جانا ۔ سارا کو اور کسی نے کبھی نہیں جانا۔

تم میں وہ شکتی ہے کہ میری چتا کی آگ کو تم نے پھول بنا دیا اور ایسا میں پہلی بار دیکھا ۔ آگ کو پھول بنانے والا پہلی بار دیکھا۔

خدا کا شکر ہے کہ اس نے اپنی زمین پر ایک انسان سے ملاقات - - - - محبت اور جیون کی ہر بڑی سچائی سے مجھے بخشا ۔ یہ تم ہو۔

زندگی کے بیکراں عذابوں کے بعد تم سے ملاقات ' اور میرا اور تمہارا بیکراں پیار ' زندگی کے کروڑوں دنوں پر ' اپنے دن کافی ہیں ۔ کائنات ہمارے دلوں میں دھڑکی ہے ' سو اس سے زیادہ خدا سے کچھ مانگنا اپنی تنگ نظری پر ماتم کرنے کے مترادف ہے۔

سمجھنا ! آنکھیں بجھ گئیں تو میں پھر بھی تمہارا انتظار کر رہی ہونگی۔ میں سو گئی تو میرا دل ہمیشہ تمہارے لئے جاگتا رہے گا۔ یہ جاگ میں نے تم سے سیکھی ' اور تم نے بڑے ضبط سے مجھے سکھائی۔ میں اپنے جنم کے تمام چراغوں سے کہہ دونگی کہ جلتے رہنا! کہ تم دیکھتے نہیں کہ سارا سعید کو دیکھ رہی ہے۔ اور آگ ہمیشہ سے انسان کا احترام کرتی ہے۔

تم مجھے کسی کھونٹی پر بھی باندھ دیتے تو میرے لئے سعادت ہوتی۔ میں تمہارے اندر کتنی موجود ہوں ' اور رہونگی۔

زندگی کی تلاش کو آج ختم کرتی ہوں کہ میں نے جان لیا ہے ـ ـ ـ ـ ـ زندگی تمہارے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں ۔

اتنے سفر اور اتنی کٹھنائیوں کے بعد کائنات کا راز ' کائنات کی زبان ' کائنات کا دل ' کائنات کا مقصد تم ہو سعید !

اور انسان کو زندگی میں کیا چاہیے ؟ خدا کا شکر ہے کہ وہ تمہاری صورت میں آکر ملا۔

۳۰.۵.۸۴

انتہائی آنسوؤں کے ساتھ ـ ـ ـ تیری سارا ' تیری اپنی سارا
لفظ لکھنا بند کرتی ہوں ـ ـ ـ تیری اپنی سارا

خودکشی کے بعد

اور سارا کے تین خط ایسے ہیں' جو ایک ہی تاریخ میں '31 مئی کی تاریخ میں سعید کے نام لکھے ہوئے ہیں ----

یہ تین خط سعید کو سارا کی موت کے بعد ملے ۔ اور تینوں خطوں میں سارا کی روح کا عالم ایسا ہے' جیسے وہ اپنی موت کے بعد یہ خط لکھ رہی ہو۔

خطوں میں لکھی ہوئی تاریخ موت سے چار دن پہلے کی ہے' لیکن اس طرح --- جیسے یہ تاریخ ایک جھوٹی گواہی دیتی ہو۔

تینوں میں سے صرف یہی دو خط ہیں' جن پر سارا نے پہلی بار سارا شگفتہ کی جگہ سارا سعید لکھا۔ جیسے جس دھرتی پر رہتے اسے سعید کا نام اپنے نام سے ساتھ وابستہ کر لینا ممکن نہیں تھا' اسی دھرتی کو چھوڑ دینے کے بعد اس کے سامنے کوئی مشکل نہیں تھی ----

سعید !

اڑ جانے والی آنکھیں' کہیں نہ کہیں تو بس رہی ہوتی ہیں۔ تمہارے دل میں' تمہاری آنکھوں میں' میں تو رہ رہی ہوں۔ کوئی گئی تھوڑا ہی ہوں پاگل !

میری مٹی تمہارے قدموں کو سلام کرتی ہے۔ بولو ! کیا کر رہے ہو۔ میری خاموش آواز تم سے دور نہیں۔ میں تم سے بول رہی ہوں۔

میں اب بھی جاگ رہی ہوں۔ ان ذروں سے پوچھو۔

تم جب بھی آتے ہو' میں تمہارے احترام میں جاگ رہی ہوتی ہوں ۔ ذرا سی چپ ہی تو ہو گئی ہوں۔ تم باتیں کرو سعید !

میں سن رہی ہوں۔ پیار ! پیار ! پیار !

۳۱ - ۵ - ۸۴

اپنے سعید کی سارا

سعید !

آواز کبھی نہیں ڈوبتی۔ یہاں تک کہ آواز خاموش بھی ہو جائے تو نہیں ڈوبتی۔ میں سانسوں کے بغیر بھی تو تمہاری ہی ہوں۔

اب تمہاری آواز میری ہی آواز ہو گی ---- میری آواز کو تمہیں نے لکھنا ہے۔ لفظوں کو زبان تمہیں نے دینی ہے۔ سیاہی نے یہ سوچ لیا ہے کہ میرا ہاتھ تھمنے والا ہے۔ ----

لکھو ! لکھو نا ! میرے لفظوں کو سونے نہیں دوگے ---- سو رہے ہو ؟ جاگو نا ! نہیں تو میں بھی سو جاؤں گی -----

۳۱ ۔ ۵ ۔ ۸۴

تمہاری اپنی بچ ---- تمہاری سارا سعید

سعید کیلئے ۔ بے پناہ محبتوں اور لڑائیوں کے ساتھ میرے سعید !

سارے ورق کی خاموشی کو اب تم نے لکھنا ہے سعید ! میری خاموشی کو اب تم نے پڑھنا ہے۔

لفظوں کی کائنات چھوڑ رہی ہوں اور تمہاری مٹی میں چھپ رہی ہوں۔

میری روح کی حفاظت کرنا۔ میں اور تم ---- اپنی خاموشی میں بھی --- ایک دوسرے کا موسم ہیں۔

دیکھو! تم میرے پاس ہو اور میں تمہارے پاس ہوں ۔ میں کبھی بھی تم سے دور تو نہیں۔ رہتی دنیا تک اسی زمین پر تمہارے لئے جاگتی رہوں گی ۔

میری آنکھوں پر اعتبار کرو۔ اور دیکھو گے نہیں ؟ میں تمہیں دیکھ رہی ہوں اور تمہارے سینے پر سر رکھ کر سو رہی ہوں۔ نہیں تو سارا کبھی سوئی ہے سعید ؟

وہ اب بھی تمہای آنکھوں میں جاگ رہی ہے۔----

ڈھیروں پیار ! تیری صرف تیری ہی سارا سعید

سارا نے آخری سانس لیتے ہوئے ---

جسکا نام اپنے نام میں شامل کر لیا' میں یہ کتاب اسی کے نام کرتی ہوں ---

سعید احمد کے نام

امرتا پریتم

آئین رنیڈ' شیو' ساحر' فراق اور فیض تک تیرے پاس بیٹھے ہیں --- بس ' ایک ہاتھ کا فاصلہ ہے' یہ طے ہو جائے گا تو میں تم سب سے بہت باتیں کروں گی --- بک شیلف کے سامنے کھڑی ہو کر نہیں' تم سب دوستوں کے ساتھ بک شیلف میں بیٹھ کر ----

امرتا پریتم

آخری حرف ---- بک شیلف

سارا کا حلیمہ کے نام لکھا ہوا آخری خط پڑھنے کے بعد صرف بک شیلف بچتا ہے اور کچھ نہیں -----

سارا اب بک شیلف میں بچی ہے، ٹھیک اسی طرح، جس طرح اس نے پیشگوئی کی تھی -----

وہ "بلدے اکبر" کی صورت میں شائع ہوئی تھی، ۱۹۸۲ میں، اور پھر "آنکھیں" کی صورت میں شائع ہوئی، ۱۹۸۵ میں، جس کی رونمائی کراچی کی آرٹ کونسل میں ۱۸ مئی کو ہوئی ---

سنا ہے ---- اس دن حاجرہ مسرور نے صدارت کی تھی، راشد نور اور احمد کمش نے سارا پر مضمون پڑھے تھے، اور اس کتاب کے لئے لکھے ہوئے میرے کچھ الفاظ تھے --- جو وہاں ثروت سلطانہ نے پڑھے تھے، ساتھ ہی سارا کی آواز میں ٹیپ کی ہوئی اس کی نظمیں سنوائی گئی تھیں اور اسکی ایک خاص نظم "سوگندھی نامہ" افتخار جالب صاحب نے اپنی آواز میں پڑھی تھی، اور ساتھ ہی کہا تھا ---- ایسی نظم لکھنے کی جرات صرف سارا کے پاس تھی۔

اور اب سعید احمد کی "سارا اکادمی" جیسے جیسے اس بک شیلف کو بڑا کرتی جائے گی، آج جو لوگ افتخار جالب صاحب کے ساتھ متفق نہیں ہیں، وہ متفق ہوتے جائیں گے، اور جب بھی اپنے اپنے بک شیلف میں سارا سے ملاقات کریں گے ---- انہیں خدا کی ایک ایسی تخلیق کا دیدار ہو گا، جسے انسان نہیں، انسانیت کہتے ہیں -----

اس وقت میں اپنے بک شیلف کے سامنے کھڑی ہوں اور سارا سے مخاطب ہوں --- دیکھو دوست، اس وقت میرے کتنے ہی عظیم دوست ---- وسشٹھ رشی اور وید ویاس سے لیکر بان بھٹ، کالی داس، سلطان باہو، وارث، سیفو، چیخوف، غالب، کازان زاکس، آئین رینڈ، شیو، ساحر، فراق اور فیض تک تیرے پاس بیٹھے ہیں --- بس، ایک ہاتھ کا فاصلہ ہے، یہ طے ہو جائے گا تو میں تم سب سے بہت باتیں کروں گی --- بک شیلف کے سامنے کھڑی ہو کر نہیں، تم سب دوستوں کے ساتھ بک شیلف میں بیٹھ کر ----

امرتا پریتم

فکشن ہاؤس
۱۸۔ مزنگ روڈ، لاہور